للی پُٹ کا سفر

جوناتھن سوئفٹ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

لِلی پُت کا سفر

(گلیور کے سفرنامہ سے ماخوذ)

مصنف

جوناتھن سوئفٹ

مرتب

م۔ندیم

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

Liliput Ka Safar

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	1976
چوتھی طباعت	:	2011
تعداد	:	1100
قیمت	:	-/12 روپئے
سلسلۂ مطبوعات	:	913

Liliput ka Safar

by

Jonathan Swift

ISBN :978-81-7587-447-3

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746 فیکس: 26108159

ای۔میل urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرس، C-7/5 لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔110035

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے برے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کرسکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

ناٹنگم شائر میں میرے والد کی معمولی سی جائیداد تھی۔ میں اپنے باپ کا تیسرا بیٹا تھا میرے چار بھائی اور تھے۔ جب میں چودہ سال کا ہوا تو کیمبرج کے ایمنوئل کالج میں میرا داخلہ کرا دیا گیا، جہاں میں تین سال تک بڑی محنت کے ساتھ پڑھا۔ لیکن یونیورسٹی کی تعلیم بڑی مہنگی تھی اور میرے والد اتنا خرچ نہیں برداشت کر سکتے تھے اس لیے مجھے لندن کے ایک مشہور ڈاکٹر جیمس بٹیس کی شاگردی میں دے دیا گیا جن سے میں نے چار سال تک تعلیم حاصل کی۔

میرے والد چچا اور دوسرے رشتہ داروں نے مل کر چالیس پاؤنڈ کی رقم اکٹھی کی اور ہر سال تیس پاؤنڈ دینے کا وعدہ کیا تاکہ میں لیڈن یونیورسٹی میں ڈاکٹری پڑھ سکوں۔ یہاں میں نے دو سال اور سات مہینے ڈاکٹری پڑھی۔ جب میں لیڈن سے واپس آیا تو میرے پرانے استاد ڈاکٹر بٹیس نے سوالو نامی پانی کے جہاز پر ڈاکٹر کی حیثیت سے میرا تقرر کرا دیا۔ اس جہاز پر میں نے ساڑھے تین سال تک خوب سفر کیا اور دنیا کے مختلف حصوں کی سیر کی۔

پھر میں نے مستقل طور پر لندن میں رہنے کا ارادہ کیا اور شادی کر کے ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کر لیا۔ لیکن ڈاکٹری کا پیشہ اتنا اچھا نہیں چلا جتنا کہ میں سوچ رہا تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا۔ اسی وقت اتفاق سے 'انٹی لوپ' نامی جہاز پر ایک معمولی تنخواہ پر نوکری مل گئی۔ یہ جہاز جنوبی سمندر کے سفر کو جا رہا تھا۔ میں برسٹل سے ۴ مئی ۱۶۹۹ء کو سفر پر روانہ ہوا۔

۵ نومبر کو ملاحوں نے سمندر میں ایک اُبھری ہوئی چٹان دیکھی۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ ہمارا جہاز سیدھا اسی چٹان سے جا کر ٹکرا گیا اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ہم چھ آدمیوں نے مل کر ایک کشتی کو جہاز پر سے اتارا اور کنارے کی تلاش میں چل پڑے۔ ہوا بہت تیز چل رہی تھی اور سمندر میں خوب اونچی اونچی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ہم ابھی زیادہ دور بھی نہیں گئے تھے کہ ہماری کشتی بھی الٹ گئی۔

مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ میرے ساتھیوں کا کیا حال ہوا۔ میرا خیال ہے کہ وہ سب کے سب ڈوب گئے۔ میں لہروں سے لڑتا اور تیرتا ہوا کسی نہ کسی طرح کنارے تک تو پہنچ ہی گیا۔ لیکن میں اتنا تھک چکا تھا کہ ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتا تھا، بس میں کنارے پر ہی لیٹ گیا اور وہیں سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو دن نکل چکا تھا۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن میں ہل بھی نہیں سکا۔ مجھے ایسا لگا کہ میرے ہاتھ پیر اور بال تک زمین میں پتلی پتلی ڈوریوں سے باندھ دیے گئے ہیں۔ میں نے قریب ہی کچھ شور سا سنا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے بائیں پیر پر کوئی چیز رینگ رہی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے سر کو اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی، میری نظر ایک بالشتیہ پر پڑی اس کا قد چھ انچ کے قریب تھا اس کے ہاتھ میں تیر کمان تھا، اور پیٹھ پر ترکش تھا اور اس کے پیچھے تقریباً چالیس اور بالشتیے تیر اور کمان سے لیس تھے۔ میرے منہ سے گھبراہٹ کے مارے چیخ نکل گئی، جسے سُن کر وہ سب ڈر کے بھاگ گئے۔

لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ سب کے سب پھر وہیں واپس آ گئے اور ان میں سے ایک نے تو یہاں تک کیا کہ میری شکل دیکھنے کے لیے اوپر تک چڑھ آیا اور میری شکل و صورت دیکھ کر حیران ہو گیا اس نے اپنی زبان سے کچھ اس قسم کی آواز نکالی۔

"ہی نا ڈیگل" اس کے ساتھیوں نے بھی اس کو کئی بار دہرایا لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔

میں نے ان پتلی پتلی ڈوریوں سے اپنے بدن کو آزاد کرنے کی کوشش کی اور کسی نہ کسی طرح سے اپنا بایاں بازو چھڑا لیا۔ مگر اسی وقت سینکڑوں سوئیاں میرے بازو پر آ کر لگیں۔

یہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ یہی اچھا ہے کہ میں چُپ چاپ پڑا رہوں۔ جب ان بالشتیوں نے دیکھا کہ میں اب خاموش ہوں اور کوئی گڑبڑ نہیں کر رہا ہوں تو انہوں نے تیر پھینکنا بند کر دیے۔

لیکن میرے دائیں کان کے قریب ٹھونکنے پیٹنے کی آواز ہو رہی تھی اور خوب شور ہو رہا تھا، میں نے اپنا سر جو ذرا گھمایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اسٹیج بنا ہوا ہے جو تقریباً زمین سے ڈیڑھ فٹ اونچا ہوگا

——— اور اس پر ایک بالشتیہ کھڑا ہے۔ یہ شاید ان کا سردار تھا۔ اس نے اپنی زبان میں ایک لمبی چوڑی تقریر کی جو میری سمجھ میں بالکل نہ آئی۔

میں نے اشاروں ہی اشاروں میں انہیں یہ بتانے کی کوشش کی کہ بھوک کے مارے میرا بُرا حال ہے۔ اس وقت پچاس بالشتیے آگے بڑھے اور انہوں نے وہ پتلی پتلی رسیاں کاٹ ڈالیں جن سے میرے سر کے تمام بال بندھے ہوئے تھے۔ میرے اغل بغل نسیڑھیاں لگا دی گئیں اور ذرا سی دیر میں تقریباً سو بالشتیے مزے مزے کے کھانوں سے بھری ہوئی ٹوکریاں لیے سیڑھیوں پر چڑھ کر میرے منہ تک پہنچے میں منہ کھول دیا کرتا تھا اور وہ کھانے کی ٹوکریاں میرے منہ میں انڈیل دیا کرتے تھے۔ میرے لیے ان کی کئی کئی ٹوکریاں بس ایک نوالے کے برابر تھیں۔ ان کی روٹیاں بندوق کی گولی سے ذرا بڑی تھیں اور گوشت کی بوٹیاں تو چڑیا کے پروں سے بھی زیادہ ہلکی تھیں، وہ سب میری بھوک اور خوراک پر تعجب کر رہے تھے۔

پھر وہ اپنے یہاں کے سب سے بڑے پانی کے پیپوں کو لڑھکاتے ہوئے لائے جن کو میں ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔ وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور مارے خوشی کے ناچنے کودنے لگے۔ جب میرا پیٹ بھر گیا تو مجھے نیند نے آگھیرا اور میں بے خبر سو گیا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ مجھے سُلانے کے لیے ان کے بادشاہ نے ڈاکٹروں کو حکم دیا تھا کہ وہ میرے کھانے میں نیند لانے والی دوا ملا دیں۔

جب میں سو گیا تو لِلی پُٹ کے شہنشاہ نے حکم دیا کہ مجھے اس کے حضور میں پیش کیا جائے۔ اس ملک کا نام لِلی پُٹ تھا۔ اسی وقت پانچ ہزار بڑھئی اور انجنیر اس کام میں جٹ گئے اور وہ گاڑی بنانے لگے جس میں مجھے لے جانا تھا۔ گاڑی کیا تھی لکڑی کا ایک ڈھانچہ تھا جو زمین سے تین انچ اونچا، سات فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا تھا۔ اس میں چوبیس پہیے لگائے گئے تھے۔

مگر مجھے اس گاڑی میں لادنا آسان کام نہ تھا۔ اس کام کے لیے ایک ایک فٹ اونچے اسّی کھمبے گاڑے گئے اور مضبوط رسّیوں میں کانٹے باندھے گئے۔ میرے ہاتھوں، پیروں اور جسم پر کپڑے کی پٹیاں لپیٹی گئیں اور ان پٹیوں میں کانٹوں کو اٹکایا گیا اور پھر ایک چرخی کے ذریعہ نو سو مضبوط بالشتیوں نے

ان رسّیوں کو کھینچا۔ تین چار گھنٹوں میں مجھے بڑی مشکلوں سے گاڑی پر لادا گیا۔ مجھے اچھی طرح سے باندھ دیا گیا تاکہ میں اِدھر اُدھر لڑھک نہ جاؤں۔

اس گاڑی کو کھینچنے کے لیے شاہی اصطبل کے پندرہ سو بڑے اور مضبوط گھوڑوں کو لگایا گیا۔ ہر ایک گھوڑا تقریباً ساڑھے چھ انچ کی اونچائی کا ہوگا۔ یہاں سے راجدھانی آدھا میل دور تھی مگر وہاں پہنچنے سے پہلے ہی رات ہوگئی اس لیے مجھے رات کو اسی گاڑی میں رکھا گیا۔ پانچ سو سپاہی میرے دونوں طرف پہرہ دے رہے تھے۔ ڈھائی سو سپاہی اپنے اپنے ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں لیے ہوئے تھے اور باقی تیر کمانوں سے لیس تھے اور تیار تھے کہ اگر میں ہلنے جلنے یا بھاگنے کی کوشش کروں تو وہ مجھے فوراً نشانہ بنا دیں۔

دوسرے دن صبح تڑکے ہی پھر سفر شروع ہوا اور دوپہر تک شہر پناہ کے دروازے سے دو سو گز کا فاصلہ طے ہو سکا۔ شہنشاہ اور اس کے سارے درباری وہاں موجود تھے۔ شہنشاہ مجھے بہت قریب سے بلکہ میرے بدن پر چڑھ کر مجھے دیکھنا چاہتا تھا لیکن جاں نثار افسروں نے اسے ایسا نہ کرنے دیا، کیونکہ اس میں شہنشاہ کی جان کو خطرہ تھا۔

میری سواری ایک بڑی پرانی عمارت کے سامنے روک دی گئی۔ یہ للی پُٹ کی سب سے اونچی عمارت خیال کی جاتی تھی۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے اس میں رکھا جائے۔ اس عمارت کے شمالی دروازے کی اونچائی صرف چار فٹ تھی اور چوڑائی دو فٹ۔ دروازے کے دونوں طرف جو کھڑکیاں تھیں وہ بہت چھوٹی سی تھیں اور زمین سے صرف چھ انچ اونچی تھیں۔ بہرحال میں اس دروازے میں سکڑ کر گھس سکتا تھا اور پاؤں سمیٹ کر سو سکتا تھا۔

ایک کھڑکی بائیں طرف تھی اس میں شاہی لوہار نے اکیانوے زنجیریں لگا دی تھیں، ان کی چوڑائی جیب گھڑی کی زنجیر سے زیادہ نہ تھی۔ زنجیروں کا ایک سرا میرے بائیں پیر سے باندھ دیا گیا اور اس میں چھتیس تالے لگا دیے گئے۔

مجھے دیکھنے کے لیے کئی لاکھ بالشتیے اُمنڈ پڑے تھے۔ جب کاریگروں کو یقین ہوگیا کہ میں اب

زنجیریں نہیں توڑ سکتا تو انہوں نے میرے جسم سے بندھی ہوئی ساری رسّیاں کاٹ ڈالیں۔ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ میں یہ کہہ نہیں سکتا کہ مجھے دیکھ کر ان سب کو کتنی حیرت ہوئی۔

2

شہنشاہ اور اس کے درباری مجھے دیکھنے کے لیے آگے بڑھے۔ شہنشاہ ایک گھوڑے پر سوار تھے۔ گھوڑے نے مجھ جیسی مخلوق اس سے پہلے کاہے کو دیکھی تھی، گھوڑا مجھے دیکھ کر بھڑک گیا۔ اگر اس کا سوار اعلیٰ درجہ کا گھوڑ سوار نہ ہوتا تو یقیناً گھوڑا اسے زمین پر پٹک دیتا۔ لیکن شہنشاہ مضبوطی اور وقار کے ساتھ گھوڑے کی پیٹھ پر جمے رہا اور نوکروں نے اسے گھوڑے کی پیٹھ پر سے اتار لیا۔ شہنشاہ نے تھوڑے سے فاصلے سے مجھے دیکھا اور خوشی اور حیرت کا اظہار کیا۔

ملکہ اور شہزادیاں کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ جب شہنشاہ کو گھوڑے سے اتارا گیا تو سب اس کے قریب آ گئے۔ شہنشاہ کا قد اپنے درباریوں سے صرف ناخن کے برابر نکلتا ہوا تھا اور وہ ان سب سے اونچا لگتا تھا۔ اس کا چہرہ باوقار تھا، اونچی سی ناک اور منھ کے دہانے سے اس کی مستقل مزاجی کا پتہ چلتا تھا۔ اس کی چال ڈھال سے ایک شان ٹپکتی تھی۔ اس کی عمر اٹھائیس سال کی تھی اور وہ سات سال سے حکومت کر رہا تھا۔ میں نے اپنا چہرہ اس کی طرف کر دیا تاکہ وہ مجھے خوب اچھی طرح دیکھ سکے۔

وہ مجھ سے تقریباً تین گز کی دوری پر تھا۔ میں نے اسے خوب اچھی طرح سے دیکھا۔ اس کا لباس بہت سادہ تھا، اس کے سر پر ایک تاج تھا جس میں ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے، اس کے ایک ہاتھ میں ننگی تلوار تھی جو لمبائی میں صرف تین انچ کے قریب تھی تاکہ اگر خدانخواستہ میں کھل جاؤں تو وہ اس سے کام لے سکے۔ اس تلوار کے دستے پر ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ شہنشاہ کی آواز باریک مگر صاف تھی۔ شہنشاہ نے کئی بار مجھ سے بات کی لیکن میری بدقسمتی سے کہ میں ان کی کوئی بات

بھی سمجھ نہ سکا۔

دو گھنٹے کے بعد شہنشاہ اور اس کے درباری رخصت ہو گئے۔ میری حفاظت کے لیے بہت سارے سپاہی موجود رہے تاکہ مجھے اُن سن چلے دیکھنے والوں سے بچائے رکھیں جو مجھے بہت ہی پاس سے دیکھنا چاہتے تھے۔ کچھ بدمعاشوں نے تو یہ کیا کہ جب میں اپنے گھر کے دروازے میں بیٹھا ہوا تھا تو مجھ پر تیر چلائے ایک تیر میری بائیں آنکھ کے قریب آن کر لگا۔ سردار نے فوراً چھ بدمعاشوں کو پکڑ کر باندھ لیا اور حکم دیا کہ میرے سپرد کر دیا جائے تاکہ میں ان کو مناسب سزا دوں۔

میں نے ان سب کو پکڑ کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ ایک کو تو پکڑ کر میں اپنے منہ تک لے گیا، جیسے میں اسے کھانا چاہتا ہوں۔ وہ ڈر کے مارے چلّانے لگا۔ میں نے اپنا چاقو نکالا۔ سپاہی سمجھے کہ واقعی میں اسکو کاٹ کر کھانا چاہتا ہوں لیکن میں نے اس کے ہاتھ پیروں کی رسّیاں کاٹ دیں اور اسے احتیاط سے زمین پر چھوڑ دیا۔ وہ بھاگ گیا۔ میں نے اس طرح سب باشندوں کو رہا کر دیا۔ میری رحمدلی کو دیکھ کر سپاہی اور دوسرے دیکھنے والے سب ہی بہت متاثر ہوئے اور میری بڑی واہ واہ ہوئی۔

میرے آنے کی خبر سن کر لِلی پُٹ میں مجھے دیکھنے کے لیے چاروں طرف ایک بھیڑ اُمنڈ پڑی یہاں تک کہ کھیت سونے ہو گئے اور لوگوں نے اپنا سارا کام کاج بند کر دیا۔ یہ دیکھ کر شہنشاہ نے ایک حکم جاری کیا کہ جو لوگ مجھے دیکھ چکے ہیں وہ واپس چلے جائیں اور بغیر اجازت کے پھر نہ آئیں۔

اسی دوران شہنشاہ نے اپنے درباریوں سے مشورہ کیا کہ میرا کیا کیا جائے۔ لیکن میرے بارے میں کوئی آخری فیصلہ نہ ہو سکا۔ انہیں ڈر تھا کہ میں کہیں قید سے بھاگ نہ جاؤں اور ان کے ملک کو نقصان پہنچاؤں۔ اس کے علاوہ میرا کھانا بھی ان کے لیے بہت مہنگا تھا۔ ان کا خیال تھا میں اتنا بہت سا کھاتا تھا کہ میرے رہنے سے ملک میں قحط پڑ سکتا تھا۔ کچھ درباریوں نے یہ رائے دی کہ میرا کھانا پینا بند کر دیا جائے۔ جبکہ کچھ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ مجھے زہریلے تیروں سے مار ڈالا جائے۔ لیکن وہ یہ طے نہیں کر سکے کہ اگر مجھے ختم کر دیں تو میرے پہاڑ سے جسم کا کیا کریں گے۔

ابھی میرے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا اور میٹنگ ہو ہی رہی تھی کہ دو فوجی افسر آئے اور انہوں نے شہنشاہ کو بتایا کہ میں نے چھ مجرموں کے ساتھ جنہوں نے مجھ پر تیر چھوڑے تھے کیا سلوک کیا۔ ساری محفل پر اس کا بہت ہی اچھا اثر پڑا اور شہنشاہ تو بہت ہی خوش ہوئے۔ اسی وقت لیدھانی کے قریب دیہاتوں میں حکم بھیجا گیا کہ ہر روز سویرے میرے لیے چھ بیل اور چالیس بھیڑیں، بہت ساری روٹیاں اور دودھ بھیجیں۔ چھ سو باشندوں کو میری دیکھ بھال کے لیے نوکر رکھا گیا۔ تین سو درزی میرے لباس کو سینے کے لیے مقرر کیے گئے اور ملک کے بہترین استادوں میں سے چھ سب سے زیادہ قابل استاد مجھے اس ملک کی زبان سکھانے پر مقرر ہوئے۔ شہنشاہ نے میری تعلیم میں بہت ہی دلچسپی لی نتیجہ یہ ہوا کہ میں بہت ہی جلد للی پُٹ کی زبان سیکھ گیا۔

میں نے سب سے پہلے شہنشاہ کی خدمت میں ایک درخواست بھیجی کہ مجھے آزاد کر دیا جائے اس کا جواب یہ ملا کہ مجھے ذرا صبر کرنا چاہیے، میری رہائی میں ابھی تھوڑا وقت لگے گا۔

شہنشاہ نے مجھ سے کہا کہ مجھے بُرا نہ ماننا چاہیے۔ اگر وہ میری جامہ تلاشی کا حکم دیں کیونکہ انہیں ڈر ہے کہ میرے پاس خطرناک قسم کے ہتھیار ہیں۔ میں نے جامہ تلاشی کے لیے مقرر کیے گئے افسروں کو اٹھا کر سب سے پہلے اپنی کوٹ کی جیبوں میں ڈالا اس کے بعد دوسری ساری جیبوں میں ڈالا انہوں نے ایک ایک چیز کی فہرست بنا کر شہنشاہ کی خدمت میں پیش کر دی۔

جب پوری فہرست شہنشاہ کو پڑھ کر سنائی گئی تو شہنشاہ نے مجھ سے بہت نرمی کے ساتھ کہا کہ میں یہ ساری چیزیں اس کے حضور میں پیش کر دوں۔ سب سے پہلے مجھے تلوار نیام سے نکالنے کا حکم دیا گیا۔ میں نے جب تلوار کو نیام سے نکالا تو اس کی چمک دیکھ کر سارے سپاہی خوفزدہ ہو گئے شہنشاہ نے حکم دیا کہ میں تلوار کو نیام میں کر کے اسے زمین پر رکھ دوں اس کے بعد کھوکھلا لوہے کا کھمبا یعنی جیبی پستول نکالنے کا حکم ہوا میں نے شہنشاہ سے عرض کیا کہ میں اس پستول کو چلا کر دکھانا چاہتا ہوں۔ جب میں نے پستول چلایا تو اسکے دھماکے سے بہت سارے باشندے زمین پر گر پڑے۔ میں نے اپنے دونوں پستول زمین پر رکھ دیے۔

میں نے اپنی جیبی گھڑی بھی نکال کر پیش کر دی۔ اس گھڑی کو دیکھ کر شہنشاہ بہت خوش ہوا اس کی مستقل ٹک ٹک کی آواز اور سیکنڈ کی سوئی کو گھومتے دیکھ کر وہ حیران ہوگیا۔

میں نے چاندی اور سونے کے سکے، بٹوا، کنگھا، حجامت بنانے کا اُسترا، نسوار رکھنے کی چاندی کی ڈبیا، رومال اور ڈائری سب شہنشاہ کے سامنے رکھدیں۔ میری تلوار، پستول، چھرے اور بارود تو شاہی بارود خانے میں رکھوادی گئیں باقی ساری چیزیں مجھے واپس کر دی گئیں۔

3

کئی بار درخواست کرنے کے بعد مجھے رہائی کا پروانہ ملا۔ اور فوج کا سپہ سالار میرے پاس خود آیا۔ میری رہائی کے بدلے میں کچھ شرطیں رکھیں۔ مجھ سے ان شرطوں کی پابندی کرنے کے لیے قسم لی گئی۔ پہلی بار تو میرے ملک کے طریقہ پر، اور دوسری بار للی پُٹ کے طریقہ کے مطابق قسم لی گئی۔ یہ قسم کھانے کا عجیب طریقہ تھا یعنی دایاں پیر بائیں ہاتھ میں سیدھے ہاتھ بیچ کی انگلی کو سر کے بیچوں بیچ رکھ کر اور انگوٹھے کو کان کی لو پر رکھ کر یہ قسم دلوائی گئی۔

۱۔ شہنشاہ ملک للی پُٹ جس سے ساری دنیا کانپتی ہے، جو بادشاہوں کے بادشاہ ہیں، اس پہاڑ نما آدمی کو حکم دیتے ہیں کہ وہ ہماری سلطنت سے بغیر شاہی اجازت کے ہرگز باہر قدم نہیں رکھے گا۔

۲۔ پہاڑ نما آدمی بغیر اجازت کے راجدھانی میں داخل نہیں ہوگا۔

۳۔ پہاڑ نما آدمی صرف خاص سڑکوں پر ہی چلا کرے گا اور نہ تو کہیں لیٹے گا اور نہ کھیتوں میں چلے پھرے گا۔

۴۔ پہاڑ نما آدمی اس بات کا خاص طور پر خیال رکھے گا کہ ہماری رعایا کے کسی آدمی کو اپنے پیروں سے نہ کچلے۔

۵۔ اگر ہم کوئی ضروری پیغام بھیجنا چاہیں تو پہاڑ نما آدمی کا یہ فرض ہوگا کہ وہ پیغام لے جانے والے کو حفاظت کے ساتھ اپنی جیب میں رکھ منزل تک پہنچا دے اور پھر اسے واپس لے آئے۔

۶۔ جزیرہ بل فیکو کے دشمنوں سے لڑائی کے وقت وہ ہمارا طرفدار ہوگا۔

۷۔ پہاڑ نما آدمی کا یہ فرض ہوگا کہ شہر پناہ کی دیواریں وغیرہ بنانے کے کام میں وہ ہمارے کاریگروں کی مدد کرے۔

۸۔ ان خدمات کے بدلے میں پہاڑ نما آدمی کو روزانہ اتنا راشن ملے گا جو ہمارے یہاں کے سات سو چوبیس آدمیوں کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی اجازت ہوگی کہ وہ جب چاہے شہنشاہ سے مل سکتا ہے۔

جیسے ہی قسم لینے کی رسم پوری ہوئی میری ساری زنجیریں کاٹ دی گئیں اور میں آزاد کر دیا گیا۔ میں نے شہنشاہ کو جھک کر تعظیم پیش کی۔ شہنشاہ نے مجھے اور بہت ساری رعایتیں دینے کا وعدہ کیا۔

4

میں نے راجدھانی کی سیر کرنے کا ارادہ کیا جس کا نام مانڈ نیڈو تھا۔ مجھے شہر میں داخل ہونے کے لیے مغربی دروازے کو پھلانگنا پڑا۔ راجدھانی کے سارے باشندے اپنے اپنے گھروں میں بند تھے لیکن میں پھر بھی بہت احتیاط کے ساتھ سڑک پر چل رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی میرے پیروں سے کچل جائے۔ لوگ مجھے دیکھنے کے لیے اپنے گھروں کی کھڑکیوں اور بالکونیوں میں امنڈ پڑے تھے۔

شاہی محل شہر کے بیچوں بیچ میں تھا۔ اس کے چاروں طرف دو فٹ اونچی دیوار تھی، مجھے شہنشاہ نے یہ اجازت دے دی تھی کہ میں اس کے محل کی دیوار پھلانگ کر محل کو خوب اچھی

طرح دیکھ لوں۔ میں لیٹ کر محل کی دوسری منزل کے خوبصورت اور عالی شان سجے ہوئے کمروں کو خوب اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ وہاں ملکہ اور شہزادیاں موجود تھیں۔ شہنشاہ نے خوشی کا اظہار کیا اور اپنا ہاتھ بڑھا کر مجھے بوسہ لینے کی عزت بخشی۔

پندرہ روز کے بعد صبح کے وقت ایک سرکاری ایلچی میرے پاس آیا اور مجھ سے کہا کہ وہ ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔ میں زمین پر لیٹ گیا تاکہ وہ میرے کان تک پہنچ سکے لیکن اس نے کہا کہ میں اسے اپنے ہاتھ میں اٹھالوں۔

سب سے پہلے اس نے مجھے میری رہائی پر مبارکباد دی اور پھر کہا کہ اس وقت ملک کو دو بڑے خطروں کا سامنا ہے، ایک تو ملک کے اندر کے دشمن اور دوسرے ملک کے باہر کے دشمن۔

ملک کے اندر دو پارٹیاں ہیں جو ایک دوسرے کی سخت مخالف ہیں۔ ایک پارٹی کے لوگ چھوٹی ایڑی کے جوتے پہنتے ہیں جبکہ دوسری پارٹی کے لوگ اونچی ایڑی کے جوتے پہنتے ہیں، ان دونوں پارٹیوں کے لوگوں میں اتنی نفرت ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کھانا پینا اور اٹھنا بیٹھنا تو دور کی بات ہے ایک دوسرے سے بات چیت بھی نہیں کرتے۔

پڑوسی ملک بلفیسکو سے ہم کو حملہ کا ڈر ہے۔ اس ملک سے ہم تین سال کے عرصہ میں کئی بار جنگ کر چکے ہیں اور ہمارے تیس ہزار بہادر اس جنگ میں مارے جا چکے ہیں اور بہت سارے پانی کے جہاز اور کشتیاں برباد ہو چکی ہیں۔ دشمن کا نقصان بھی تقریباً اتنا ہی ہوا ہے۔

اس نے مجھے بتایا کہ ملک کے اندر دو پارٹیاں کیسے بنیں اور دونوں میں دشمنی کیونکر ہوئی، اس وقت جو شہنشاہ ہیں ان کے پردادا جب بچے تھے تو ایک بار وہ اپنی چھری سے انڈا کاٹ رہے تھے ان کی انگلی کٹ گئی بات یہ تھی کہ ملی پُٹ میں پرانے زمانے سے یہ رواج چلا آرہا ہے کہ انڈے کو لمبائی میں کاٹتے تھے لیکن جب سے ہمارے شہنشاہ کے پردادا کی انگلی کٹی تو ان کے والد نے یہ حکم جاری کیا کہ آیندہ سے ملک کوئی باشندہ انڈے کو لمبائی میں نہ کاٹے بلکہ چوڑائی میں کاٹا کرے۔

رعایا نے اس حکم کی بڑی سختی سے مخالفت کی یہاں تک کہ اس بات پر ملک میں چھ بار بغاوت ہوئی ایک بادشاہ کو تو جان سے ہاتھ بھی دھونا پڑا۔ ہمارے پڑوسی ملک بلیفسکو کے بادشاہ نے ان ہنگاموں کو خوب بڑھاوا دیا۔ اس نے تمام باغیوں کو اپنے ملک میں پناہ دی، ملک کے اندر اس انڈے توڑنے کے جھگڑے میں اب تک گیارہ ہزار آدمی جان سے ہاتھ دھو چکے ہیں اور آج تک یہ جھگڑا ختم نہیں ہوا ہے۔

آخر میں اس نے مجھے بتایا کہ شہنشاہ سلامت مجھ پر بہت اعتبار کرتے ہیں اور میری ہمت اور طاقت سے انہیں پوری امید ہے کہ میں دشمنوں کے مقابلہ میں ضرورت پڑنے پر ان کی مدد کروں گا ملک بلیفسکو کے بادشاہ نے ایک بڑا سا جہازی بیڑہ تیار کیا ہے اور وہ لوگ ہم پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔

میں نے اس کی ساری بات سُن کر کہا کہ جہاں تک آپ کے گھریلو معاملوں کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں، کیونکہ میں ایک غیر ملکی مسافر ہوں۔ ہاں اگر کوئی دوسرا ملک لی لی پت پر حملہ کرتا ہے تو یہ میرا فرض ہے کہ میں اس ملک کی حفاظت کے لیے اپنی جان بھی دے دوں۔

ایلچی میری بات سے بہت مطمئن ہو کر خوش خوش واپس گیا۔

5

اب جزیرہ بلیفسکو کا حال سنیے۔ ملک لی لی پت اور بلیفسکو کے بیچ صرف ایک نہر ہے جو آٹھ سو گز چوڑی ہے۔ میں نے ایک پہاڑی پر چڑھ کر دیکھا کہ دشمن یعنی بلیفسکو والوں کے پاس پانی کے جہازوں کا ایک بڑا سا بیڑہ ہے۔

میں لی لی پت کی راجدھانی گیا اور شہنشاہ سے عرض کی کہ مجھے لوہے کی چند چھڑیں اور بہت

سارا تار دیا جائے۔ جب یہ ساری چیزیں مجھے مل گئیں تو میں نہر کے کنارے گیا اور اپنے کپڑے اتار کر پانی میں گھس گیا اور تیرتا ہوا بلفیسکو کے جہازوں کے قریب پہنچ گیا۔ جہاز کے ملاح مجھے دیکھ کر اتنے ڈرے کہ وہ بدحواس ہو کر پانی ہی میں کود پڑے۔ میں نے لوہے کے کانٹوں میں جہازوں کو پھنسایا اور تاروں میں باندھ کر پانی میں تیرتا ہوا واپس آیا۔ بلفیسکو کے سپاہیوں نے بہت شور مچایا اور تیروں کی بارش کی۔ ان کو اپنے جہازوں کے اس طرح چھن جانے کا بہت افسوس ہوا۔

للی پٹ کے ساحل پر شہنشاہ اور ان کے درباری اور فوج کے سپاہی کھڑے تھے۔ انہوں نے دشمنوں کے جہازی بیڑے کو آتے ہوئے دیکھا، لیکن چونکہ میں پانی کے اندر تھا اس لیے وہ مجھے نہ دیکھ سکے اور سمجھے کہ میں شاید ڈوب گیا ہوں۔ وہ یہ جان کر بہت پریشان ہوئے لیکن جب میں پانی سے باہر نکلا اور میں نے نعرہ لگایا "شہنشاہ للی پٹ، زندہ باد!" تو وہ سب مارے خوشی کے ناچ اٹھے۔ شہنشاہ للی پٹ نے مجھے 'نیس مارخاں' کا خطاب دیا۔ یہ ملک للی پٹ سب سے بڑا خطاب تھا۔

اب شہنشاہ نے مجھے حکم دیا کہ میں دوبارہ بلفیسکو جاؤں اور دشمن کے باقی بچے ہوئے جہاز اٹھا لاؤں۔ دراصل شہنشاہ یہ چاہتے تھے کہ اس طرح وہ بلفیسکو کے بادشاہ کو مجبور کر دیں گے کہ ہمیشہ کے لیے اپنی ہار مان لے اور وہ بھی انڈے کو چوڑائی میں توڑے۔ اس طرح شہنشاہ للی پٹ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وہ صرف ملک للی پٹ ہی کے نہیں ساری دنیا کے شہنشاہ ہیں۔

مگر میں نے اس بات پر اعتراض کیا اور شہنشاہ سے کہا کہ میں ایک آزاد ملک کے لوگوں کو غلام بنانے میں ان کی مدد نہیں کر سکتا۔

میرے انکار کرنے پر شہنشاہ کے سارے منصوبے مٹی میں مل گئے۔ انہوں نے بھی مجھے اس جرم کے لیے کبھی معاف نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ میرے دشمن تھے ان کو اچھا موقع مل گیا اور میرے خلاف شہنشاہ کے کان بھرنے لگے۔

تین ہفتے کے بعد بلفیسکو کے بادشاہ نے ایک جماعت بھیجی اور صلح کی درخواست کی۔

شہنشاہ ملی پت نے اپنی من مانی شرطوں پر صلح کی۔ بلفیکو کی جماعت میں چھ ایلچی تھے۔ انہوں نے مجھ سے بھی ملاقات کی اور اپنے بادشاہ کی طرف سے اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی۔ میں نے ان کے بادشاہ اور ان کا شکریہ ادا کیا اور بلفیکو آنے کا وعدہ کیا۔

6

بادشاہ کے درباریوں میں میرا ایک بہت ہی اچھا دوست تھا۔ ایک رات وہ کسی نہ کسی طرح میرے پاس چھپتا چھپاتا ہوا آیا۔ میں نے اسے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور اپنے گھر کے سارے دروازے بند کر دیے اور اسے میز پر رکھ دیا۔ اس نے میری خیریت پوچھی اور مجھے بتایا کہ شہنشاہ نے خفیہ طریقہ پر جلسے کیے ہیں۔ فوج کا سپہ سالار میرا جانی دشمن ہے، وہ میری عزت اور شہرت سے جلنے لگا ہے۔ دوسرے درباری جو مجھ سے جلتے ہیں ان سے مل کر سپہ سالار نے مجھ پر ملک سے بغاوت اور شہنشاہ سے نافرمانی کا الزام لگایا ہے اور یہ بہت ہی سنگین جرم ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ آخری جلسے میں میرے بارے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے موت کی سزا دی جائے اور میرے مکان میں اسوقت آگ لگا دی جائے جب میں سو رہا ہوں۔ فوج کا سپہ سالار بیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ باہر کھڑا ہوگا تاکہ زہریلے تیروں سے میرے چہرے اور ہاتھوں کو چھلنی کر دیا جائے۔

پھر اس نے کہا کہ جب شہنشاہ نے اس سے رائے معلوم کی تو اس نے کہا کہ پہاڑ سے آدمی کے اس ملک پر بہت سارے احسان ہیں اس لیے اس کی جان بخشی کر دی جائے۔ ہاں بغاوت اور نافرمانی کے جرم میں آنکھیں نکال دی جائیں۔

لیکن سب نے یہ کہا کہ صرف آنکھیں نکال لینا بہت ہلکی سزا ہوگی بہتر یہ ہوگا کہ پہاڑ نما آدمی کے کھانے کی مقدار دھیرے دھیرے کم کر دی جائے، نتیجہ یہ ہوگا وہ کمزور ہو کر ایک دن خود

بخود مر جائے گا۔ سب نے اس پر اتفاق کیا، اب تین دن کے اندر شہنشاہ کا ایک حکم آئے گا کہ میری صرف آنکھیں پھوڑی جائیں گی۔ شہنشاہ کو یقین ہے کہ میں اس کے حکم کی تعمیل میں چون وچرا نہیں کروں گا۔ تین شاہی ڈاکٹر آکر تیروں سے میری آنکھیں پھوڑیں گے۔

میرا دوست یہ سب بتا کر چلا گیا۔

میں بہت دیر تک پڑا سوچتا رہا۔ آخر میں نے شہنشاہ کی خدمت میں ایک خط لکھا کہ میں ملک بلفیسکو کی سیر کرنے جا رہا ہوں۔ میں نے خط بھیج دیا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر میں نہر کے کنارے آیا اور میں نے اپنے کپڑے اتارے اور اپنا کمبل اور کپڑے بلفیسکو کے جہازی بیڑے پر لادے اور ان جہازوں کو لوہے کی سلاخوں کے کانٹوں میں پھنسایا اور تاروں سے باندھ کر تیرتا ہوا واپس بلفیسکو لے گیا۔

بلفیسکو کی زمین پر قدم رکھتے ہی میرا بڑا شاندار استقبال کیا گیا۔ بادشاہ، درباری اور محل کے لوگ اور ایک بہت بڑی بھیڑ وہاں موجود تھی۔ میرے آنے پر بڑی خوشیاں منائی گئیں اور میری آنے کی خوشی میں ایک بہت بڑی دعوت کا انتظام کیا گیا۔

لیکن بلفیسکو میں چونکہ ایسی کوئی بڑی عمارت نہیں تھی جہاں میں رہ سکتا اس لیے مجھے کھلی جگہ میں کمبل لپیٹ کر سونا پڑا۔

7

مجھے بلفیسکو میں آئے ابھی تیسرا دن ہوا تھا۔ میں دریا کے کنارے ٹہل رہا تھا کہ میں نے ایک الٹی ہوئی کشتی پانی میں دیکھی۔ میں کپڑے اتار کر پانی میں گھس گیا۔ ہوا کے زور سے کشتی کنارے تک آگئی تھی۔ یہ کشتی کسی بڑے جہاز کی تھی۔

میں نے بلفیسکو کے بادشاہ سے درخواست کی کہ مجھے اپنے ملک میں جانے کی اجازت دی جائے۔ بادشاہ نے میری درخواست فوراً منظور کر لی۔ میرے جانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ کشتی

کے بادباں بنانے کے لیے پانچ سو کاریگروں کو نوکر رکھا گیا۔ تیرہ رضائیوں کے برابر موٹائی کے کپڑوں کو ملا کر سیا گیا۔ پردوں کو چکنا کرنے کے لیے تین سو بیلوں کی چربی استعمال کی گئی۔ مجھے ایک بھاری سی چٹائی مل گئی جس کا میں نے لنگر بنایا۔ مستول بنانے کے لیے ملک کے سب سے بڑے پیڑوں کو کاٹنا پڑا۔

جب ساری تیاریاں مکمل ہوگئیں تو میں بادشاہ کے پاس رخصت لینے حاضر ہوا۔ بادشاہ نے مجھے تحفے کے طور پر پندرہ تھیلیاں سونے سے بھری ہوئی دیں اور اپنی قدآدم تصویر بھی یادگار کے طور پر دی۔ میں نے یہ ساری چیزیں اپنے دستانے میں حفاظت کے ساتھ رکھ لیں۔ میں نے اپنی کشتی میں کھانے پینے کے علاوہ دو سو بیل اور تین سو بھیڑیں بھی رکھ لیں۔

۲۴ ستمبر ۱۷۰۱ء کی صبح کو میں نے کشتی سے سفر شروع کیا۔ دو دن سفر شروع کرنے کے بعد مجھے ایک پانی کا جہاز نظر آیا۔ شاید جہاز والوں نے مجھے دیکھ لیا تھا کیونکہ جہاز کے بادبان اتار دیے گئے تھے۔ اور اس کی رفتار دھیمی ہوگئی تھی۔ مجھے جہاز پر چڑھا لیا گیا۔ میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا کہ اب میں جلد ہی اپنے وطن پہنچ جاؤں گا۔ ۱۳ اپریل ۱۷۰۲ء کو میں انگلینڈ پہنچا۔ یہاں میں نے اپنے جالوز بہت ہی اچھی قیمت میں بیچ دیے اور اپنے گھر والوں سے ملنے کو روانہ ہوا۔ میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ دو مہینے تک رہا کہ میرا دل سفر کے لیے پھر مچلنے لگا۔

میرے خاندان والوں نے مجھے بہت روکا لیکن میں اڈونچر نامی جہاز پر سوار ہوگیا جو سورت کو جا رہا تھا۔ اس کا کپتان نکولاس تھا یہ لیورپول کا باشندہ تھا۔

ملک بروبڈنگناگ کا سفر

میں اڈونچر نامی جہاز پر اپنے سفر کو روانہ ہوا۔ مڈغاسکر تک ہوا خوب موافق چلتی رہی لیکن جب ہم شمال کی جانب ہولیے تو مالنسوئی ہوائیں چلنے لگیں۔ طوفانی ہوا ہمارے جہاز کو مشرق کی طرف اتنی دور تک لے گئی کہ جہاز پر سوار سب سے بوڑھا ملاح بھی یہ نہ بتا سکا کہ وہ کون سی جگہ ہے اور

اس کا کیا نام ہے۔ ہمارے جہاز پر کھانے کا سامان تو کافی مقدار میں تھا لیکن پانی ختم ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے ہمیں بڑی ہی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک دن ہم کو خشکی نظر آئی، کپتان نے ایک کشتی میں بارہ آدمی بٹھا کر جو ہتھیاروں سے لیس تھے پانی لانے کے لیے کنارے کی طرف بھیجے۔ میں بھی کپتان کی اجازت سے ان کے ساتھ ہو لیا کہ دیکھوں یہ کون سی جگہ ہے۔

میں اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر ذرا دور تک چلا گیا۔ لیکن وہ جگہ ویران تھی۔ میں جب واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے دوسرے ساتھی کشتی کو بہت تیز چلاتے ہوئے جہاز کی طرف لے جا رہے ہیں اور ایک بہت بڑے قد کا دیو اس کشتی کا پیچھا کر رہا ہے۔ میں اپنے ساتھیوں کو پکارنے والا تھا مگر اس دیو کو دیکھ کر ڈر کے مارے میری آواز نہ نکل سکی۔ چونکہ پانی میں چھوٹی بڑی چٹانیں بھری ہوئی تھیں اس لیے دیو جلدی کشتی تک نہ پہنچ سکا اور کشتی اس سے دور اور گہرے پانی میں نکل گئی۔

میں ڈر کر بھاگا اور ایک پہاڑی پر چڑھ گیا۔ یہ جگہ خوب ہری بھری تھی اور یہاں کی گھاس بھی بیس فٹ اونچی تھی۔ میں بھاگتا بھاگتا ایک کھیت میں پہنچا جس کی بالیاں تقریباً چوبیس فٹ اونچی تھیں یہ کھیت بالکل پک گیا تھا اور کٹنے کو تیار تھا۔

میں ایک گھنٹے تک چلتا رہا۔ یکایک میری نظر ایک دیو قامت انسان پر پڑی۔ اسکی لمبائی کیا بتاؤں بس یوں سمجھیے جیسے کسی گرجا گھر کا اونچا مینارہ۔ اس کا ایک ایک قدم دس دس گز کا پڑتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ایک کھیت میں چھپا لیا۔ اسی وقت اس دیو نے کسی کو پکارا۔ اسکی آواز کیا تھی بجلی کی کڑک تھی۔ اسی وقت سات دوسرے دیو قامت آدمی جو اسی کے قد کے برابر تھے، ہاتھوں میں ہنسیے لیے ہوئے آئے اور کھیت کاٹنے میں جُٹ گئے۔

میں اسی کھیت میں تھا اور ساتوں دیو جلدی جلدی کھیت کاٹ رہے تھے۔ مجھے ہر لمحہ یہ ڈر تھا کہ میں اب کچلا تب کچلا۔ ایک بار ڈر کے مارے میری چیخ نکل گئی۔ میری چیخ سن کر ایک دیو نے خوب غور سے اِدھر اُدھر دیکھا اور مجھ پر اسکی نظر پڑ گئی۔ اس نے مجھے پکڑ کر اٹھا لیا۔ میں نے دونوں ہاتھ

جوڑ کر اس سے رحم کی درخواست کی۔ اس نے میری پریشانی کو شاید بھانپ لیا اور مجھے اپنی مٹھی میں زور سے دبانا بند کر دیا اور اپنے مالک کے پاس لے گیا۔

ان لوگوں نے اس سے پہلے مجھ جیسی مخلوق کبھی نہیں دیکھی تھی اس لیے مجھے دیکھ کر وہ سب حیرت میں پڑ گئے۔ کسان نے مجھے زمین پر رکھ دیا میں فوراً پیروں کے بل کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنا ٹوپ اتار کر سلام کیا اور گھٹنوں کے بل جھک کر رحم کی بھیک مانگی۔ میں نے اسکو کچھ سونا بھی پیش کیا لیکن وہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ کیا چیز ہے۔ میں نے اس سے کئی زبانوں میں بات چیت کی لیکن وہ میری بات نہ سمجھ سکا۔ آخر اس نے مجھے احتیاط کے ساتھ ایک رومال میں لپیٹا اور اپنے گھر لے چلا۔ اس وقت تک کسان بھی یہ بات سمجھ گیا تھا کہ میں بھی ایک عقل رکھنے والی کوئی مخلوق ہوں۔

کسان کی بیوی مجھے دیکھ کر چیخ پڑی جیسے کہ اکثر عورتیں کسی مینڈک یا مکڑی کو اپنے قریب دیکھ کر ڈر کے مارے چیخ پڑتی ہیں۔ لیکن جلد ہی کسان کی بیوی مجھ سے مانوس ہو گئی۔ وہ میرا بڑا خیال رکھتی تھی۔ ایک لکڑی کے تختے پر میرے لیے چھوٹی سی رکابی میں گوشت اور روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے رکھ دیتی تھی میں اس کا شکریہ ادا کر کے اپنی جیب سے چھری کانٹا نکال کر کھانا شروع کر دیتا تھا۔ وہ سب یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتے تھے۔

ایک بار کھانے کی میز پر یہ ہوا کہ کسان کے چھوٹے بیٹے نے جس کی عمر کوئی دس برس کی ہو گی میری ٹانگوں کو پکڑ کر خوب گھمایا مگر اسی وقت کسان نے مجھے بچا لیا اور اپنے بیٹے کے ہاتھوں سے مجھے چھین لیا۔ اس کے کان کھینچے اور اس سے باہر نکل جانے کو کہا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ سارے بچے فطرتاً شریر ہوتے ہیں اس لیے میں نے گھٹنوں کے بل جھک کر اشاروں سے کسان کو بتایا کہ وہ اپنے بیٹے کی اس شرارت کو معاف کر دے۔ مجھے ڈر تھا کہ لڑکا کہیں میرا دشمن نہ ہو جائے اور مجھے پریشان نہ کرے۔ لڑکے کی خطا معاف کر دی گئی اور وہ کھانے کی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں اس کے قریب گیا اور اس کے ہاتھ چومے۔

کھانے کے دوران کسان کی پالتو بلی کسان کی بیوی کی گود میں آ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنے

قریب ہی میاؤں میاؤں کا شور سنا اور سر گھما کر دیکھا تو ایک بلّی دکھائی دی جو ڈیل ڈول میں ہمارے یہاں کے بیل سے تین گنا بڑی تھی۔ کسان نے اٹھا کر مجھے اس کے قریب رکھ دیا۔ میں ڈرے بغیر اس کے چاروں طرف گھوما پھرا، وہ مجھے دیکھ کر سہم سی گئی اور بھاگ گئی۔

جب کھانا ختم ہو گیا تو ایک آیا اپنی گود میں ایک بچے کو لیے ہوئے آئی۔ اس بچے کی عمر ایک سال کی رہی ہو گی۔ اس نے مجھے دیکھا اور گڑیا سمجھ کر مجھے لینے کو مچلنے لگا اور رونے لگا۔ کسان کی بیوی نے مجھے اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے مجھے اپنے منہ میں رکھنا چاہا۔ لیکن میں ڈر کے مارے اتنی زور سے چیخا کہ بچہ سہم گیا اور اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ اگر اس وقت کسان کی بیوی مجھے نہ بچا لیتی تو یقیناً میرا سر تو پھٹ ہی گیا ہوتا۔

میں دن بھر کے ہنگاموں سے بہت تھک گیا تھا۔ کسان کی بیوی نے مجھے اپنے بستر پر سلا دیا اور میرے اوپر ایک رومال ڈال دیا۔ میں بے خبر سو گیا۔ خواب میں میں نے اپنی بیوی بچوں کو دیکھا اور جب میری آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو تنہا پا کر بہت رنجیدہ ہوا۔ میرا کمرہ باہر سے بند تھا۔ کسان کی بیوی باورچی خانہ میں کام کر رہی تھی۔ میں بستر سے باہر نکلنا چاہتا تھا لیکن پلنگ کی اونچائی دیکھ کر میری ہمت نہیں پڑتی تھی کہ نیچے کود دوں۔ میرا چلّانا بھی بیکار تھا کیونکہ باورچی خانے تک میری آواز نہیں پہنچ سکتی تھی۔

اسی وقت کہیں سے دو چوہے میرے پلنگ پر چڑھ آئے۔ میں ڈر کے مارے کھڑا ہو گیا۔ ان دونوں نے مجھ پر حملہ کر دیا میں نے اس وقت ہمت سے کام لیا اور اپنی تلوار نکال کر ان پر وار کیا میں نے ایک کا پیٹ تلوار سے پھاڑ ڈالا۔ دوسرا بھاگ گیا۔ چوہے اتنے بڑے تھے جیسے کوئی بڑا شکاری کتّا۔ اگر اس وقت میرے پاس تلوار نہ ہوتی تو وہ مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے۔

تھوڑی دیر کے بعد میری مالکہ آ گئی اس نے مجھے خون میں لتھڑا ہوا دیکھا تو گھبرا گئی۔ لیکن میں نے اسے اشارے سے بتایا کہ میں نے ایک چوہے کو مار ڈالا ہے، اور میرے کوئی زخم نہیں آیا ہے۔ وہ یہ جان کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے نوکرانی کو بلایا اور مرے ہوئے چوہے کو کھڑکی سے پھینکوا دیا۔

مجھے ایک میز پر بٹھایا اور میرے بدن سے خون صاف کیا گیا۔

2

میری مالکہ یعنی کسان کی بیوی کی ایک لڑکی تھی جس کی عمر نو سال کی تھی۔ وہ بہت عقلمند اور محنتی لڑکی تھی، اور سینے پرونے کا کام تو بہت اچھا کر لیتی تھی۔ اس نے میرے لیے اچھے کپڑے کی سات قمیضیں تیار کیں۔ حالانکہ یہ کپڑا ٹاٹ کے برابر موٹا تھا۔ وہ میرے کپڑے خود دھویا کرتی تھی اور مجھے اپنی زبان سکھا کر خوش ہوا کرتی تھی۔ میرے سونے کے لیے اور مجھے چوہوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک پالنا بنایا گیا تھا۔ یہ پالنا میز کی ایک چھوٹی سی دراز میں رکھ دیا جاتا تھا اور دراز کو الماری کے خانے میں بند کر دیا جاتا تھا۔

آس پاس کے علاقے میں میرے بارے میں خوب شہرت ہو گئی تھی کہ میرے مالک کے پاس ایک عجیب قسم کا جانور ہے جس کا قد صرف چھ فٹ کے قریب ہے۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر چلتا ہے لیکن انسانوں کی طرح بولتا ہے، سیدھا سادھا اور شریف ہے اور جب بلایا جاتا ہے تو پاس بھی آجاتا ہے۔

میرے مالک کا ایک دوست ایک دن مجھے دیکھنے آیا۔ مجھے بلایا گیا اور مجھے ایک میز پر کھڑا کیا گیا۔ میں نے اسے چل کر دکھایا۔ اپنی تلوار نکالی اور گھمائی اس کی تعظیم میں جھکا اور ان کی زبان میں معزز مہمان کو خوش آمدید کہا۔

یہ دوست بہت چالاک اور کنجوس تھا۔ اس نے میرے مالک کو مشورہ دیا کہ وہ میرے ذریعے خوب روپیہ کما سکتا ہے۔ قریب کے قصبے میں جو میلہ لگتا ہے اس میں میری نمائش کی جائے تو اچھی خاصی رقم مل سکتی ہے۔

میری ننھی مالکہ جس کا نام گلمڈالکلچ تھا۔ اس نے مجھے ساری باتیں بتائیں۔ وہ اس بات سے رنجیدہ تھی کیونکہ اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی گنوار میرے ہاتھ پیر نہ توڑ ڈالے۔ مگر میں [illegible]

نہیں ہوا تھا، مجھے امید تھی کہ میں جلد ہی یہاں سے رہائی پالوں گا۔

میلے کے دن میرا مالک مجھے قریب کے قصبے میں لے گیا۔ اس کی لڑکی گلمدالکلچ بھی ساتھ تھی۔ میرے لیے ایک صندوق بنایا گیا تھا جو چاروں طرف سے بند تھا اور اس کا صرف ایک دروازہ تھا۔ ہوا کے لیے دو سوراخ تھے۔ گلمدالکلچ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس نے میرے نیچے اپنی گڑیا کا بستر بچھا دیا تھا۔ حالانکہ قصبہ بہت دور نہ تھا لیکن مجھے سفر میں بہت پریشانی ہوئی۔ گاڑی کے گھوڑے بہت بڑے اور اونچے تھے جن کا ایک ایک قدم چالیس فٹ کے برابر پڑتا تھا اور وہ ایسا اونچا اچھلتے تھے کہ جیسے سمندر میں طوفان کے وقت کوئی جہاز اچھلتا ہے۔

میرے مالک نے ایک سرائے میں رہنے کا انتظام کیا اور ایک بڑا سا کمرہ کرایے پر لیا اور ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ ایک انسان نما جانور نمائش کے لیے آیا ہے جو انسانوں کی طرح رہتا ہے، کھاتا پیتا ہے اور بول بھی سکتا ہے۔ جن کو دیکھنا ہو چیل والی سرائے میں آکر دیکھ سکتا ہے۔ اس اعلان کا نتیجہ اچھا نکلا اور سارا قصبہ اور آس پاس کے دیہاتوں کے لوگ مجھے دیکھنے کو ٹوٹ پڑے۔

سرائے کے سب سے بڑے کمرے میں مجھے ایک میز پر رکھا گیا۔ میرے قریب ہی میری دوست گلمدالکلچ ایک پیڑھی پر بیٹھی تھی اور بتاتی جاتی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ ایک وقت میں صرف تیس آدمیوں کو دیکھنے کی اجازت تھی۔ میں نے میز پر چل کر دکھایا۔ کچھ سوالوں کے جواب ان ہی کی زبان میں دیے ان کو خوش آمدید کہا۔ اپنی کمر سے تلوار نکال کر اور گھما کر دکھائی۔

پہلے روز مجھے بارہ مرتبہ دکھایا گیا۔ ہر بار مجھے ایک ہی قسم کی حرکتیں دہرانا پڑتی تھیں اس لیے میں بہت ہی تھک گیا اور اکتا گیا۔ جو لوگ مجھے دیکھ کر جاتے تھے وہ میرے بارے میں کچھ ایسی عجیب عجیب باتیں بتاتے تھے کہ جس کی وجہ سے دیکھنے والوں کا شوق اتنا بڑھ گیا کہ سرائے کے دروازے کے ٹوٹنے کی نوبت آگئی۔ خدا خدا کر کے میلہ ختم ہوگیا اور مجھے گھر واپس لائے لیکن گھر پر بھی میرے مالک کے دوستوں اور رشتہ داروں کا تانتا بندھا رہتا تھا جو مجھے ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے۔

اب میرے مالک کو اس بات کا اندازہ ہوچکا تھا کہ وہ میری نمائش کرکے کافی رقم کما سکتا ہے اس لیے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے بڑے بڑے شہروں میں لے جاکر دکھائے اور خوب روپیہ کمائے۔ اس نے سفر کی تیاری شروع کی اور ۱۷ اگست ۱۷۰۳ء کو (یعنی اس ملک میں میرے آنے کے دو ماہ بعد) ہم لوگ راجدھانی کے لیے روانہ ہوئے۔ راجدھانی وہاں سے تین ہزار میل کے فاصلے پر تھی۔ میری مالکہ گلمڈالکلچ بھی میرے ساتھ تھی۔ میں اپنے بکس نما کمرے میں بند تھا اور بکس گلمڈالکلچ کی کمر سے بندھا ہوا تھا۔

سفر کے دوران ہم لوگ آرام کرنے کے لیے رک بھی جاتے تھے۔ گلمڈالکلچ کو میری تکان کا بہت خیال رہتا تھا اور وہ اپنے باپ سے یہ بہانا بناتی کہ وہ تھک گئی ہے۔ مجھے بکس میں سے نکالتی تاکہ مجھے تازہ ہوا میں سانس لینے کا موقع مل جائے۔

۲۶ اکتوبر کو ہمارا قافلہ راجدھانی میں پہنچا جس کا نام 'لور بلبرگرد' تھا جس کے معنی اس زبان میں 'فخرِ جہاں' کے ہیں۔ میرے مالک نے ایک مکان کرایہ پر لیا جو شاہی محل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میرے بارے میں عجیب عجیب باتیں لکھا کر بڑے بڑے اشتہار شہر کی دیواروں پر لگوائے گئے۔ مجھے دیکھنے والوں کی کمی نہ تھی۔ ایک بڑے سے ہال میں نمائش کا انتظام کیا گیا۔ ایک خوب اونچی اور لمبی چوڑی میز بچھائی گئی جس کے چاروں طرف تین تین فٹ اونچی روک لگائی گئی تاکہ میں گر نہ پڑوں۔ دن بھر میں میری دس بار نمائش کی جاتی تھی۔ ساری راجدھانی میں میرا ہی چرچا تھا کیونکہ اس سے پہلے کسی نے بھی مجھ جیسی مخلوق نہیں دیکھی تھی۔

3

روزانہ کی سخت محنت اور بے آرامی نے مجھے بیمار کردیا۔ میں کمزور ہوگیا، میری بھوک بھی ختم ہوگئی مگر میرے مالک کو میری کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ بہت خوش تھا کیوں کہ اسکی

آمدنی میں روزانہ بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔

ایک دن میرے مالک کے پاس ایک شاہی ہرکارہ آیا اور کہا کہ بادشاہ سلامت مجھے دیکھنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے مجھے ملکہ کے حضور میں پیش کیا گیا۔ میں ملکہ کی تعظیم میں گھٹنوں کے بل جھکا۔ ملکہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس نے میرے اور میرے ملک کے بارے میں چند سوال کیے اور پھر بولی کہ کیا میں اسکی خدمت میں رہنا پسند کروں گا۔ میں نے جواب دیا کہ اس کے حضور میں رہ کر مجھے بہت خوشی ہوگی لیکن کسان کی بیٹی گلمڈالکلچ بھی اگر میرے ساتھ ہی رہے تو بڑی مہربانی ہوگی۔

ملکہ نے میری درخواست قبول کرلی۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ میں اٹھالیا اور بادشاہ کو دکھانے لے چلی۔ بادشاہ پہلی نظر میں نہیں پہچان سکا کہ ملکہ کے ہاتھ میں کیا ہے اس نے مجھے شاید چوہا سمجھا اور ملکہ سے بولا کہ تمہیں یہ چوہے پالنے کا شوق کب سے ہوا۔

ملکہ نے مجھے لکھنے کی میز پر کھڑا کردیا اور مجھ سے کہا کہ میں بادشاہ سلامت کو اپنے بارے میں بتاؤں کہ میں کون ہوں۔ میں نے چند لفظوں میں اپنے بارے میں بتایا۔ بادشاہ نے سمجھا کہ شاید میں ایک مشینی گڑیا ہوں جسکو کسی ماہر کاریگر نے بنایا ہے۔ لیکن جب میں نے بولنا شروع کیا اور اسکی باتوں کا جواب دیا تو اسے یقین ہوا کہ میں واقعی کوئی جاندار چیز ہوں۔

جب میں نے بادشاہ کو یہ بتایا کہ میں کس طرح اس ملک میں پہنچا تو بادشاہ کو یقین ہی نہیں آیا۔ بادشاہ نے اپنے ملک کے تین سب سے زیادہ عقلمندوں کو بلایا۔ ان عقلمندوں نے مجھے خوب غور سے دیکھا اور بتایا کہ میں کوئی معمولی قسم کا جانور ہوں کیوں کہ نہ تو قدرت نے دوسرے جانوروں کی طرح مجھے دانت یا پنجے عطا کیے ہیں۔ میں درختوں پر بھی نہیں چڑھ سکتا، نہ ہی گڑھا کھود کر اس میں رہ سکتا ہوں اور نہ ہی بھاگ کر اپنی جان بچا سکتا ہوں۔ انہوں نے میرے دانتوں کو غور سے دیکھا اور نتیجہ نکالا کہ میں گوشت خور جانوروں کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ اگر کسی جانور سے ملتی جلتی شکل رکھتا ہوں تو وہ صرف جنگلی چوہا ہو سکتا ہے، لیکن وہ بھی مجھ سے بڑا ہے۔ میری غذا کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ میں کیڑے مکوڑے یا گھونگے کھاتا ہوں۔

میں نے بادشاہ سلامت سے عرض کیا کہ میرے ملک میں میری ہی طرح کے کروڑوں انسان بستے ہیں۔ وہاں جانور بھی ہیں اور پیڑ پودے بھی اور مکان بھی ہیں۔ یہ ساری چیزیں ہمارے ہی قد و قامت کے مطابق ہیں۔ جب میں اپنے ملک میں تھا تو کھانا بھی کھاتا تھا اور اپنے دشمنوں سے بچاؤ بھی کرتا تھا۔ یہ سُن کر تینوں عقلمند مُسکرائے لیکن بادشاہ معقول انسان لگتا تھا اس نے میری باتوں کا اعتبار کیا۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ میرے آرام کا ہر ممکن خیال رکھا جائے۔ گلمدارلکلچ کو میری دیکھ بھال کرنے کے لیے میرے ساتھ ہی رکھ لیا گیا۔

4

ملکہ نے میرے لیے ایک نہایت ہی خوبصورت اور مضبوط بکس بنوایا۔ اس میں دو کھڑکیاں تھیں اور ایک بڑا سا دروازہ تھا۔ یہ میرے سونے کا کمرہ تھا۔ شاہی بڑھئی نے میرے لیے دو میزیں دو کرسیاں اور ایک کپڑوں کی الماری بھی بنا دی تھی۔ ملکہ نے میرے لیے بہت باریک کپڑے کا عمدہ لباس بھی بنوا دیا تھا۔ مجھے یہاں ہر قسم کا آرام تھا اور میں یہاں اپنی تمام زندگی گزار سکتا تھا اگر میرا قد اتنا چھوٹا نہ ہوتا۔

ایک دن صبح کے وقت میری نگراں گلمدارلکلچ نے مجھے تازہ ہوا کھلانے کی غرض سے میرا صندوق کھڑکی کے کنڈے سے لٹکا دیا۔ میں صبح کا ناشتہ کر رہا تھا اور ایک میٹھا کیک رکابی میں رکھا ہوا تھا اس وقت کہیں سے شہد کی مکھیاں اڑتی ہوئی ادھر آگئیں شاید ان تک کیک کی خوشبو پہنچ گئی تھی ان کی آواز کیا تھی جیسے بہت ساری بین ایک ساتھ بج رہی ہوں۔ دو تین مکھیاں میرے کیک پر ٹوٹ پڑیں اور اسے اپنے پنجوں میں دبا کر اڑ گئیں۔ کچھ میرے منھ اور سر پر سنڈلانے لگیں۔ ڈر کے مارے میرا خون خشک ہو گیا اس وقت میں نے ہمت سے کام لیا اور تلوار کھینچ لی اور چار کو جان سے مار ڈالا۔ میں نے ان مری ہوئی مکھیوں کو احتیاط سے رکھ لیا، یہ ہمارے یہاں کے تیتروں کے برابر تھیں

دوران کے ڈنک ڈیڑھ انچ کے تھے۔

ملکہ میرا بہت خیال رکھتی تھی اور جب بھی مجھے اُداس دیکھتی تو باتیں کر کے میرا غم دور کرنے کی کوشش کرتی۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ میں ایک کشتی کا نمونہ بناؤں۔ میں نے وہ نمونہ بنا کر دیا۔ ملکہ نے اسی نمونے کی ایک اچھی سی کشتی شاہی بڑھیوں سے تیار کرا دی۔ لکڑی کا ایک بڑا سا ٹب جو تین سو گز لمبا اور پچاس گز چوڑا تھا بنانے کا حکم دیا۔ یہ ٹب محل کے ایک برآمدے میں رکھ دیا گیا اور اس میں پانی بھر دیا گیا۔ اس میں میری کشتی ڈالی گئی۔ یہ ٹب ایک چھوٹی سی جھیل کا کام کرتا تھا۔ میں اکثر اس میں کشتی چلایا کرتا تھا اور اپنا دل بہلایا کرتا تھا۔ ملکہ اور اس کی سہیلیاں مجھے کشتی چلاتا دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتی تھیں۔

کبھی کبھی ملکہ کی کوئی سہیلی اپنے پنکھے سے ہوا کرتی جس سے بادبان میں ہوا بھر جاتی اور کشتی پانی میں ادھر ادھر دوڑنے لگتی۔ کبھی کوئی خادمہ اپنی منہ کی پھونک سے بادبان میں ہوا بھر دیتی اور جب یہ تماشہ ختم ہو جاتا تو گلمڈالکلچ میری کشتی کو اٹھا کر الماری میں رکھ دیتی یا کسی کیل میں سوکھنے کے لیے لٹکا دیتی۔

ایک بار یہ ہوا کہ ایک مینڈک اس پیالے میں کود گیا اور چھپ کر بیٹھ رہا۔ جب میری کشتی پانی میں اتاری گئی تو یہ کم بخت اس سے کھیلنے لگا۔ میری کشتی ڈگمگانے لگی۔ یہی نہیں اس نے اپنے اگلے پنجوں کو میری کشتی پر رکھ دیا جس سے وہ ایک طرف کو جھک گئی۔ میں نے پوری طاقت سے پتوار ماری اور وہ اچھل کر باہر نکل گیا اور میری جان بچی۔

لیکن سب سے بڑا خطرہ جس کا مجھے مقابلہ کرنا پڑا وہ تھا ایک شیطان بندر۔ یہ بندر ایک باورچی کا چہیتا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک بار گلمڈالکلچ کہیں باہر کام سے گئی ہوئی تھی اس نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ میں صندوق نما کمرہ میں آرام سے بیٹھا تھا۔ میں نے کسی کے کودنے کی آواز سُنی۔ میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا کہ ایک بندر کمرے میں اِدھر اُدھر اُچھل کود رہا ہے۔ وہ میرے بکس کے پاس آیا اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی اس نے اپنے ہاتھ کو صندوق کے دروازہ میں ڈالا

اور پکڑ کر مجھے باہر نکال لیا اور اپنی مٹھی میں دبا لیا۔ میں نے جب اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی تو وہ مجھے اور زور سے دبانے لگا۔ میں نے اپنی بھلائی اسی میں جانی کہ خاموش رہوں۔ میرا خیال ہے وہ مجھے بندر کا بچہ سمجھ رہا تھا کیونکہ کئی بار اس نے اپنی ہتھیلیوں سے بہت دھیرے دھیرے منہ پر طمانچے مارے جیسے کہ کوئی ماں اپنے شریر بچے کو تھپ تھپاتی ہے۔

اسی وقت چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں ... بندر! بندر! پکڑنا! دوڑنا! بندر گھبرا کر کھڑکی سے کودا اور چھت پر چڑھ گیا۔ میں نے گلمڈالکلچ کی چیخیں سنیں وہ بے چاری رو رہی تھی اور چلّا رہی تھی۔ نوکروں نے سیڑھیاں لگا دیں اور چھت پر چڑھ گیے۔ ہزاروں لوگ محل کے آنگن میں کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جب بندر نے یہ دیکھا کہ وہ چاروں طرف سے گھر گیا ہے تو اس نے مجھے ایک جگہ چھوڑ دیا اور کودتا پھاندتا یہ جا وہ جا ــ

میں چھت کے کنارے پر بیٹھا ہوا تھا اور ڈر رہا تھا کہ کہیں ہوا اڑا کر مجھے نیچے نہ پھینک دے مجھے چکر بھی آ رہا تھا۔ مگر اسی وقت ایک لڑکا مجھ تک پہنچ گیا اور مجھے بہت حفاظت کے ساتھ اپنی جیب میں رکھ کر نیچے اتار لایا۔

اس حادثے کے پندرہ دن بعد تک میں بستر پر پڑا رہا۔ میرے جسم کے مختلف حصّوں پر خراشیں پڑ گئی تھیں اور سارے بدن میں درد ہو رہا تھا۔ بندر کو موت کی سزا ملی اور ملکہ نے حکم دیا کہ اس قسم کا کوئی بھی جانور محل میں نہ رکھا جائے۔ بادشاہ مجھے دیکھنے آیا اور مجھ سے مذاق کیا کہ جس وقت بندر نے مجھے پکڑا تھا اس وقت مجھے کیسا لگ رہا تھا۔

5

مجھے محل میں ہر طرح کا آرام تھا بادشاہ اور ملکہ میرا بڑا خیال رکھتے تھے اور مجھے بہت ہی عزیز رکھتے تھے لیکن میں دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگا کرتا تھا کہ وہ دن جلد آئے جب میں اپنے

ہی جیسے انسانوں کی دنیا میں پہنچ جاؤں ۔ ان سے برابری سے باتیں کرسکوں، آزادی کے ساتھ سڑک پر چل پھر سکوں۔

ان دیوزادوں کے ملک میں میرا یہ دوسرا سال تھا۔ تیسرے سال کے شروع میں ملکہ اور بادشاہ ملک کے جنوبی حصّے میں سیر کے لیے گئے۔ میں اور گلمدالکلچ بھی ان کے ساتھ تھے۔ بادشاہ کا محل سمندر کے کنارے تھا۔ لمبے سفر کے بعد میں بھی تھک گیا تھا اور بے چاری گلمدالکلچ کو سردی لگ گئی تھی اور بستر پر پڑی ہوئی تھی۔

میں نے ملکہ سے درخواست کی کہ میں سمندر کے کنارے سیر کرنے جانا چاہتا ہوں۔ ملکہ نے بڑی خوشی سے اجازت دے دی اور ایک لڑکا جو کبھی کبھی میری دیکھ بھال کیا کرتا تھا، میرے ساتھ کردیا گلمدالکلچ بڑی مشکل سے راضی ہوئی وہ مجھے کسی کے ساتھ کہیں نہیں جانے دیتی تھی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو تھے جیسے وہ مجھے ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ رہی ہو۔

لڑکے نے میرا بکس اٹھالیا اور ہم دونوں سمندر کے کنارے پہنچ گئے۔ میں نے لڑکے سے کہا کہ میں اپنے کمرے ہی میں آرام کروں گا، چنانچہ میں اپنے بکس ہی میں لیٹ کر سوگیا۔ لڑکا شاید چڑیوں کے انڈے تلاش کرنے چلا گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ میرا بکس ہوا میں اوپر اٹھ رہا ہے۔ میں زور زور سے لڑکے کو پکارنے لگا لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔

اسی وقت میں نے پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز سُنی تو میری سمجھ میں آیا کہ میرا بکس کسی چیل نے اپنے پنجوں میں دبالیا ہے اور وہ اسے کسی چٹان پر پھینک دے گی اور بکس کے ساتھ ساتھ میری ہڈیاں پسلیاں بھی ٹوٹ جائیں گی۔

پھر مجھے ایسا لگا کہ کئی چیلیں آپس میں لڑ رہی ہیں اور میرا بکس چھیننے کی کوشش کر رہی ہیں اسی وقت میں نے محسوس کیا کہ میرا بکس تیزی کے ساتھ اونچائی سے نیچے کی طرف گر رہا ہے، پھر ایک جھپاکہ کے ساتھ وہ گر پڑا، مجھے جھٹکا سا لگا۔

تب میں نے جانا کہ میرا بکس سمندر میں گرا ہے۔ چونکہ یہ بکس کافی مضبوط تھا اس لیے بہت

تھوڑا سا پانی اندر آیا، میں میز پر پیر رکھ کر کمرے کی چھت تک چڑھا اور روشندان تک پہنچ کر میں نے مدد کے لیے پکارا۔ لیکن کہیں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میرا صندوق لہروں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا تھا، اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں بھوکا پیاسا مر جاؤں گا۔

چار گھنٹے بیت گئے، میں نے کچھ آواز سی سُنی۔ اپنی چھڑی میں رومال باندھا اور روشندان سے باہر نکال کر ہلایا اور مدد کے لیے چلّایا۔ جواب میں کسی نے کچھ کہا، میرا دل خوشی کے مارے اچھلنے لگا۔ میرے بکس کی چھت پر کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی پھر کسی نے زور سے انگریزی زبان میں کہا: "کوئی اندر ہے ؟"

میں نے فوراً جواب دیا: "میں ایک انگریزی باشندہ ہوں، خدا کے لیے میری مدد کیجیے۔"

جہاز کے بڑھیوں نے دروازہ کو توڑا اور مجھے باہر نکالا۔ میری حالت بہت خستہ ہو رہی تھی اور میں بہت کمزور ہو گیا تھا۔ کپتان مجھے اپنے کمرے میں لے گیا اور اس نے مجھے کھانے پینے کو دیا۔ میں نے کپتان سے درخواست کی کہ میرے کمرے میں بہت سا قیمتی سامان ہے اسے نکال لیا جائے میری ساری چیزیں نکال لی گئیں اور اس کمرے نما بڑے صندوق کو سمندر میں ڈبو دیا گیا۔

میں نے کپتان کو اپنی بپتا سنائی، وہ بھی سن کر حیرت میں پڑ گیا۔ میں نے اپنی الماری میں سے چند نادر چیزیں نکال کر اُسے دکھائیں جو میں نے دیوزادوں کے ملک میں جمع کی تھیں، ان میں سوئیاں اور پن بھی تھیں جو آدھے آدھے گز لمبی تھیں۔ ایک سونے کی انگوٹھی تھی جو ملکہ نے مجھے دی تھی۔ یہ انگوٹھی ملکہ نے اپنی چھنگلی میں سے اتار کر میرے گلے میں ڈال دی تھی۔ اس کے علاوہ ایک بٹوہ بھی تھا جو چوہے کی کھال کی بنی ہوئی تھی۔

جہاز کا سفر جلد ہی ختم ہو گیا اور میں ۳ جون ۱۷۰۶ء کو انگلینڈ پہنچ گیا۔ کپتان نے مجھ سے کرایہ کا ایک پیسہ بھی نہیں لیا۔ جب میں سڑک پر چل رہا تھا تو مجھے لگ رہا تھا کہ میں ایک بار پھر بونوں کے ملک للی پٹ میں پہنچ گیا ہوں کیونکہ ان دنوں تک دیووں کے ملک میں رہتے رہتے اپنے آپ کو دیو ہی سمجھنے لگا تھا۔ میں اپنے بیوی بچوں اور دوستوں سے بہت ہی جھک کر ملتا تھا

جیسے وہ سب بونے ہوں۔ میری بیوی کو تو یقین ہوگیا تھا کہ میرے دماغ میں ضرور کچھ خرابی ہوگئی ہے۔

بہرحال بہت دنوں کے بعد مجھے یقین ہوا کہ میں اپنے ہی جیسے انسانوں کے درمیان میں ہوں میری بیوی نے مجھ سے التجا کی کہ میں آئندہ سمندر کے سفر پر نہ جاؤں۔

مُلک لاپُوٹا کا سفر

مجھے اپنے گھر پر آئے ہوئے ابھی صرف دس ہی دن ہوئے تھے کہ میرا ایک دوست رابنسن مجھ سے ملنے آیا۔ وہ ایک جہاز کا کپتان تھا۔ میں پہلے بھی اس کے جہاز پر ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کر چکا تھا۔ وہ بہت ہی اچھا آدمی تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا جہاز ایسٹ انڈیز کے سفر پر جا رہا ہے۔ اگر میں اس کے جہاز پر ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کروں تو وہ مجھے دوگنی تنخواہ دے گا۔ میں نے اسکی پیشکش کو قبول کر لیا۔ میری بیوی بڑی مشکل سے راضی ہوئی۔ بہرحال ہم لوگ ۵ اگست ۱۷۰۶ء کو سفر پر روانہ ہوئے اور سینٹ جارج میں ۱۱ اپریل ۱۷۰۷ء کو پہنچ کر وہاں سے ٹانکن تک پہنچ گئے۔ کپتان نے یہاں کچھ دنوں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ تجارت کا جو سامان جہاز پر لادنا تھا وہ تیار نہیں تھا۔ کپتان نے ایک چھوٹی کشتی خریدی اور اس میں وہ تجارت کا سامان بھرا جو آس پاس کے جزیروں میں بک سکتا تھا۔ اس کشتی پر چودہ آدمیوں کو سوار کیا اور مجھے ان کا نگران بنایا، اور کہا کہ وہ دو مہینے تک یہاں رہے گا اس وقت تک ہم لوگ یہ سامان بیچ کر آجائیں۔

چوتھے دن سمندر میں طوفان آگیا اور ہماری کشتی راستے سے بھٹک گئی۔ دسویں دن ہم پر سمندری لٹیروں نے حملہ کر دیا اور ہماری کشتی کو پکڑ لیا اور سارا سامان لوٹ لیا۔ وہ لوگ ہم کو گرفتار کر کے سردار کے سامنے لے گئے۔ سردار ڈچ قوم کا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ ہمارے ہاتھ پیروں کو باندھ کر سمندر میں ڈال دیا جائے۔ لیکن لٹیروں کا ایک اور سردار وہاں موجود تھا جو

جاپانی تھا۔ وہ ہمارے پاس آیا اور ہم سے بہت ساری باتیں پوچھیں، اس نے کہا کہ ہم سب کی جان بخشی کر دی جائے گی۔ میں نے اس کا بہت ہی شکریہ ادا کیا اور ڈچ سردار سے کہا کہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس نے میرا ہم مذہب ہوتے ہوئے بھی رحم نہ کھایا اور ایک کافر نے رحم کیا۔ میری یہ بات سن کر ڈچ سردار بہت ناراض ہوا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ مجھے سخت سے سخت سزا دی جائے۔ چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ مجھے ایک چھوٹی سی کشتی میں بٹھا کر سمندر میں چھوڑ دیا جائے اور میرے ساتھ صرف چار دن کے لیے کھانے پینے کا سامان ہو۔ رحمدل جاپانی سردار نے اپنے پاس سے چار دنوں کے کھانے پینے کا اور بھی سامان میرے ساتھ رکھ دیا۔

مجھے کشتی میں بٹھا کر سمندر میں چھوڑ دیا گیا۔ میں نے اپنی جیبی دوربین سے دیکھا کہ جنوب مشرق کی سمت بہت سارے چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں۔ میں سب سے قریب والے جزیرہ تک پہنچ گیا یہاں چڑیوں کے بہت سارے انڈے تھے۔ میں نے جلانے کے لیے سوکھی ہوئی کائی اکٹھا کی اور انڈوں کو بھون کر کھایا۔ میں نے اپنے کھانے کے سامان میں سے کچھ بھی نہیں کھایا اور وقت ضرورت کے لیے رکھ چھوڑا۔ میں نے وہ رات ایک چٹان کے نیچے گذاری۔

اس طرح میں ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے تک روز سفر کرتا رہا۔ پانچویں روز جس جزیرے میں پہنچا وہ بہت ہی پتھریلا تھا میں نے چڑیوں کے انڈوں سے پیٹ بھرا اور ایک غار میں رات گذاری۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔

دوپہر کے وقت جبکہ آسمان خوب صاف تھا اور دھوپ چمک رہی تھی میں ایک چٹان پر کھڑا تھا۔ یکایک مجھے ایسا لگا جیسے آسمان ڈھک گیا ہے اور کسی چیز نے سورج کو چھپا لیا ہے میں نے آسمان کی طرف دیکھا تو مجھے بڑی ہی حیرت ہوئی، ایک بڑی سی چیز ہوا میں اڑتی ہوئی دکھائی دی جو زمین سے دو میل اونچائی پر تھی۔ میں نے اپنی دوربین نکال کر اس عجیب وغریب اڑتی ہوئی چیز کو دیکھا اس پر بہت سارے لوگ سوار تھے جو ادھر اُدھر چلتے پھرتے نظر آرہے تھے مجھے یہ دیکھ کر اور بھی تعجب ہوا کہ ایک شہر کا شہر ہوا میں اڑ رہا ہے اور جو لوگ اس پر سوار ہیں

جب چاہتے ہیں اسکو اوپر یا نیچے کر لیتے ہیں، اور جدھر چاہتے ہیں ادھر لے جاتے ہیں۔

جب یہ شہر ذرا قریب آگیا تو مجھے اسکی عمارتیں، بڑے بڑے ہال اور سیڑھیاں اور اس پر سوار لوگ اچھی طرح دکھائی دینے لگے۔ میں ایک اونچی سی چٹان پر کھڑا ہو گیا اور اپنی ٹوپی اور رومال کو ہلانے لگا۔ جب یہ اُڑن شہر میرے بہت ہی قریب آگیا تو میں پوری طاقت سے چلّایا۔

میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ برآمدے میں سے نیچے کی طرف جھانک رہے ہیں۔ پھر چند آدمی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے نظر آئے، شاید وہ سب سے اوپر کی منزل میں کچھ حکم دینے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ شہر میرے بالکل پاس آگیا۔ ایک آدمی نے مجھ سے کچھ کہا لیکن میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا کہ وہ کس زبان میں بات کر رہا ہے۔ مگر ان لوگوں نے میری پریشانی کا اندازہ لگا لیا اور اس جزیرے میں اکیلا دیکھ کر یہ سمجھ گئے کہ میں کتنا پریشان ہوں۔ انھوں نے اوپر سے ایک زنجیر پھینکی اس میں ایک گدّی بندھی ہوئی تھی میں اس میں بیٹھ گیا اور انھوں نے مجھے اوپر کھینچ لیا۔

2

جیسے ہی میں اڑن شہر میں پہنچا مجھے لوگوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر حیرت کر رہے تھے۔ میں نے اب تک ایسے لوگ پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ہر ایک کا سر دائیں طرف یا بائیں طرف جھکا ہوا تھا۔ ان کی ایک آنکھ ناک کی طرف دیکھتی تھی اور دوسری آسمان کو دیکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ان کے جسموں پر جو لباس تھے ان پر چاند، سورج، ستارے، گھوڑے باجے اور گانے بجانے کی چیزوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ نوکروں کا لباس پہنے ہوئے تھے ان کے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک چھڑی تھی جس کے ایک سرے پر ایک تھیلی بندھی ہوئی تھی اس میں کنکریاں یا سوکھے مٹر بھرے ہوئے تھے۔ یہ نوکر ذرا ذرا سی دیر کے بعد اپنے قریب کھڑے ہوئے لوگوں کے منھ اور

ناک پر اس تھیلی سے مارتے تھے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ لوگ اتنی گہری سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں کہ نہ تو دوسرے کی بات سن سکتے ہیں اور نہ سمجھ ہی سکتے ہیں۔ جب تک کہ ان کو اس طرح بار بار چھڑی میں بندھی تھیلی سے مار مار کر ہوشیار نہ کیا جائے۔ اس لیے ہر خاندان میں ایک 'چھڑی مار' نوکر ضرور رکھا جاتا ہے۔

مجھے جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ لوگ کتنے بھلکڑ ہیں۔ وہ چلتے چلتے ایک دم راستہ میں رک جاتے تھے اور یہ بھی بھول جاتے تھے کہ ان کو آگے چلنا ہے۔

مجھے بادشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا۔ بادشاہ تخت پر بیٹھا ہوا تھا، وہ بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے سامنے میز پر بہت سارے گلوب، پرکار اور ناپنے کے آلے رکھے ہوئے تھے۔ وہ کسی ضروری مسئلے کے سلجھانے میں اُلجھا ہوا تھا۔ ہم لوگوں کو ایک گھنٹہ تک انتظار کرنا پڑا جب اس کے دونوں طرف کھڑے ہوئے خادموں نے دیکھا کہ بادشاہ اب اپنے تمام کام کر چکا ہے تو ان میں سے ایک نے بادشاہ کے کان پر اور دوسرے نے منھ پر چھڑی سے بندھی تھیلیوں سے مارا، بادشاہ ایک دم جیسے خواب سے چونک پڑا اور ہماری طرف متوجہ ہوا۔

بادشاہ کچھ بولا اور اس کے نوکروں نے میرے کان اور منھ پر چھڑی سے مارا، مگر میں نے یہ ظاہر کیا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ اس بات کا انھوں نے بُرا مانا۔ بادشاہ نے پھر مجھ سے کچھ کہا جو میں نہیں سمجھ سکا۔ میں نے اپنی بات کہی جو بادشاہ کی سمجھ میں نہ آئی۔ اور جب یہ طے ہوگیا کہ ہم ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف ہیں تو وہ مجھے ایک اور کمرے میں لے گئے۔ یہ کھانے کا کمرہ تھا۔ میرے ساتھ چار اور معزز مہمان تھے۔ یہ کھانا عجیب قسم کا تھا۔ گوشت کے ٹکڑے چوکور اور مثلث نما تھے اور حلوہ بانسری اور بربط باجے کی شکل کا تھا۔

اسی شام ایک پروفیسر مجھ سے ملنے آیا۔ اس کے ساتھ بھی ایک 'چھڑی مار' نوکر تھا جو بار بار [illegible] منھ پر چھڑی مارا کرتا تھا۔ یہ پروفیسر چار گھنٹے تک میرے ساتھ رہا۔ میں نے اس کی گفتگو سے [illegible] کی زبان کا کچھ اندازہ لگا لیا اور میں [illegible] ان کی [illegible] سمجھنے لگا۔ دوسرے دن صبح ایک

درزی میرے لیے کپڑوں کی ناپ لینے آیا۔ اس نے میرے جسم کو بوسے کے گز، پیمانے اور پرکار سے ناپا اور جب چھ دن بعد وہ میرے کپڑے سی کر لایا تو وہ بہت تنگ اور چھوٹے تھے۔ دراصل اس سے حساب لگانے میں غلطی ہوگئی تھی۔

اس ملک کی زبان علم حساب اور موسیقی سے مل کر بنی تھی۔ ان کے مکانات بھی عجیب شکل کے تھے اور وہ لوگ خود بھی عجیب و غریب تھے۔ وہ بے حد کاہل، غبی، نکھٹو قسم کے انسان تھے مگر علم حساب اور گانے بجانے کے فن میں ماہر تھے۔

یہ لوگ چاند، سورج اور ستاروں کے علم میں بہت دلچسپی لیتے تھے اس کے ساتھ ساتھ سیاست اور ملکی معاملات پر غور کرتے رہتے تھے۔ لیکن ان کی طبیعت میں بڑی بے چینی تھی اور ہمیشہ کسی نامعلوم خوف سے ڈرے رہتے تھے۔ ان کو ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ سورج زمین کو کھا جائے گا اور جلد ہی سورج میں دراڑیں پڑ جائیں گی اور دنیا سورج کی روشنی سے محروم ہو جائے گی۔ وہ سب ان اندیشوں کی وجہ سے رات کو چین سے سو بھی نہیں سکتے تھے اور صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے یہ دیکھتے تھے کہ سورج نکلا یا نہیں، اور اسکی روشنی کیسی ہے؟۔

3

یہ اڑنے والا شہر بالکل ٹھوس اور گول تھا۔ اسکا نچلا حصہ طشتری کی شکل کا تھا اور خالص ہیرے کا تھا۔ اسکے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا غار تھا جس سے ہو کر نجومی نیچے ایک بڑے گنبد میں جاتے تھے جس کا نام 'نجومیوں کی غار' تھا۔ یہاں بیس چراغ ہر وقت جلتے رہتے تھے۔ ان کی روشنی ہیروں والی دیواروں سے ٹکرا کر سارے گنبد کو خوب جگمگا دیا کرتی تھیں۔ اس جگہ نجومیوں کے استعمال کے بہت سارے آلات رکھے ہوئے تھے۔

مگر سب سے ضروری چیز تو ایک بہت بڑا مقناطیسی کھمبا تھا جس کی شکل جلاہوں کے کپڑا بُننے

کی نلی سے ملتی جلتی تھی۔ یہ نلی ہیرے کے ایک ڈھیرے پر ٹکی ہوئی تھی۔ یہی مقناطیسی پتھر سارے اڑن جزیرے کی جان تھا۔ اسی کے سہارے کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ 'اڑن شہر' کو اتارا جا سکتا تھا اوپر اٹھایا جا سکتا تھا یا نیچا کیا جا سکتا تھا اور اسے کسی طرف بھی موڑا جا سکتا تھا۔ نجومی اس کمپے کی بہت دیکھ بھال کیا کرتے تھے، وہ ہر وقت دوربینوں کی مدد سے تاروں کو دیکھا کرتے تھے ان کی دوربینیں ہماری دوربینوں سے کہیں زیادہ عمدہ تھیں۔ وہ بہت سارے ایسے ستاروں کا پتہ لگا چکے تھے جن کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے تھے۔ وہ زہرہ ستارہ کے بارے میں ہم سے کہیں زیادہ جانتے تھے اور دمدار ستاروں کے بارے میں بھی ان کی معلومات بہت زیادہ تھیں۔

یہ اڑن شہر بادشاہ کی سب سے زیادہ انمول اور قیمتی دولت تھی۔ اگر کسی شہر میں کبھی بغاوت ہوتی تو بادشاہ کے پاس اس بغاوت کو کچلنے کے لیے دو ترکیبیں تھیں۔ پہلی ترکیب ذرا نرم تھی اور وہ یہ تھی کہ 'اڑن شہر' اس شہر پر جہاں بغاوت ہوتی تھی منڈلاتا رہتا تھا، یہاں تک کہ شہر کے لوگ سورج کی دھوپ اور بارش سے محروم ہو جاتے اور قحط اور بیماریوں کا شکار ہونے لگتے اور پھر اکر بادشاہ کی اطاعت قبول کر لیتے۔ دوسری ترکیب بہت سخت قسم کی تھی اور بادشاہ کو وہ ترکیب کبھی کبھی استعمال کرنا پڑتی تھی۔ جب باغی کسی طرح بغاوت سے باز نہ آتے تو بادشاہ اس 'اڑن شہر' کو باغیوں کے شہر اور گاؤں پر اتار دیتا تھا اور سارے باغی اور ان کے گھر بار اور جانور دب کر ختم ہو جاتے تھے۔

اس ملک کا ہر آدمی اپنے آپ میں مگن رہتا تھا اور دن رات علم حساب یا فن موسیقی کے بارے میں اپنی معلومات بڑھانے میں ڈوبا رہتا تھا۔ میں بدقسمتی سے نہ حساب جانتا تھا اور نہ مجھے موسیقی کے بارے میں کچھ معلوم تھا، سارے کے سارے لوگ ایک جیسے نہ تھے۔ کچھ لوگ دوسرے کاموں میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔

ایک دن میں کچھ لوگوں کے پاس بیٹھا ہوا تھا یہ لوگ بڑی اچھی عادتوں کے تھے۔ ایک آدمی نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے ان کے یہاں کا 'امر آدمی' بھی دیکھا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کیسا

ہوتا ہے۔ اس پر مجھے بتایا گیا کہ کبھی کبھی کسی خاندان میں کوئی ایسا بچہ بھی پیدا ہو جاتا ہے جس کے ماتھے پر ایک لال نشان ہوتا ہے، یہ اس بات کی نشانی ہوتا ہے کہ یہ آدمی کبھی نہیں مرے گا۔ پیشانی کا یہ نشان بچے کی عمر کے ساتھ ساتھ بدلتا بھی رہتا ہے، یعنی کبھی ہرا، کبھی نیلا اور آخر میں جا کر کالا ہو جاتا ہے۔

میں یہ سُن کر بہت ہی خوش ہوا اور کہا کہ کتنے خوش قسمت ہیں وہ بچے جو موت کے خوف سے آزاد پیدا ہوتے ہیں اور خوش قسمت ہے وہ ملک اور قوم، جو ایسے لافانی انسانوں کو جنم دیتے ہیں۔

یہ سُن کر وہ لوگ بہت ہنسے اور مجھے ایسا لگا جیسے کہ وہ میرا مذاق اڑا رہے ہوں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ اگر میں 'امر آدمی' ہوتا تو کیا کرتا؟

میں نے جواب دیا کہ سب سے پہلے تو بہت ساری دولت اکٹھا کرتا تاکہ جب دو سو سال کی عمر کو پہنچوں تو بے شمار دولت میرے پاس جمع ہو جائے اور میں ملک کا سب سے زیادہ مالدار انسان بن جاؤں۔ مجھے بچپن ہی سے ادب اور سائنس سے دلچسپی تھی اور میں بڑے شوق سے ادب اور سائنس کا مطالعہ کرتا تھا۔ اگر میں امر ہو جاتا تو کوئی دوسرا آدمی ادب اور سائنس میں میری برابری نہیں کر سکتا تھا اور پھر آخری بات جو میں کرتا وہ یہ کہ ضروری واقعات اور حالات کو لکھتا رہتا تاکہ برابر میرا علم بڑھتا رہے۔ اس طرح میں علم اور دولت دونوں سے مالا مال ہو جاتا۔

میں ساٹھ سال کی عمر تک شادی نہ کرتا اور ملک کے نوجوانوں کو اپنے تجربہ کی روشنی سے صحیح راستہ دکھاتا۔ اپنے دوسرے ساتھی 'امر آدمیوں' کو اپنے ساتھ رکھتا اور اگر ان کے پاس مکان اور روپیہ نہ ہوتا تو میں ان کی مدد کرتا اور برائیوں کے خلاف لڑتا اور ملک سے برائیاں ختم کرنے کی کوشش کرتا وغیرہ وغیرہ۔

انھوں نے کہا کہ یہ دنیا کا ایک ہی ملک ہے جہاں 'امر آدمی' پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا کے دوسرے ملکوں میں لوگ زیادہ لمبی عمر تک جینے کی دعائیں مانگتے ہیں، لیکن اس ملک میں 'امر آدمی' ہونا کوئی اچھی بات نہیں سمجھی جاتی۔ کیوں کہ اہم بات یہ نہیں ہے کہ 'امر آدمی' اپنی شروع کی زندگی میں دولت

کمانے یا صحت بنانے کے لیے کیا کرتا ہے بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جب بڑھاپے میں آدمی ناکارہ اور کمزور ہو جاتا ہے اور چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو جاتا ہے تو زندگی کا کوئی مزہ نہیں رہتا اور وہ بے چارہ مر بھی نہیں سکتا۔

اس نے یہ بھی بتایا کہ ہر 'امر آدمی' تیس سال تک تو ہماری ہی طرح زندگی بسر کرتا ہے، دولت کماتا ہے اور خوب عیش کرتا ہے، لیکن اس کے بعد اس پر اداسی چھانے لگتی ہے اور جب وہ اسّی سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو بڑھاپے کی ساری حماقتیں اور کمزوریاں اُسے گھیر لیتی ہیں اور وہ ہر وقت پریشان سا رہنے لگتا ہے کیونکہ اسے یہ معلوم ہے کہ وہ ہمیشہ اسی حالت میں زندہ رہے گا۔ سارے 'امر آدمی'، چڑچڑے، ضدّی، بھلکڑ اور ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اسّی سال کی عمر میں ان کو 'ناقابل' ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا جاتا ہے وہ کسی سرکاری ملازمت میں نہیں رکھے جا سکتے اور نہ ہی کوئی جایداد خرید سکتے ہیں اور نہ بیچ ہی سکتے ہیں۔ نوّے سال کی عمر میں ان کے دانت گر جاتے ہیں اور سر کے بال جھڑ جاتے ہیں، ذائقہ کی قوت ختم ہو جاتی ہے، بغیر بھوک کے کھاتے ہیں اور بغیر پیاس کے پانی پیتے ہیں۔ ان کی یادداشت اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ وہ کوئی کتاب پڑھ کر اپنے دل کو بہلا بھی نہیں سکتے اور نہ اپنے کو مصروف رکھ سکتے ہیں کیونکہ وہ کسی کتاب کے آخری حصّے تک شروع کا حصّہ بھول جاتے ہیں۔

میں نے چار پانچ 'امر آدمیوں' کو دیکھا اور ان کی حرکتیں دیکھ کر مجھے ساری باتوں کا یقین ہو گیا ان میں سب سے کم عمر کا 'امر آدمی' ڈھائی سو سال کا تھا۔

بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ میرے ملک میں 'امر آدمی' نہیں ہوتے تو اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس کے ملک سے چند 'امر آدمیوں' کو لے جاؤں اور اپنے ملک کے لوگوں کو بتاؤں کہ نہ مرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اس ملک کے قانون کے مطابق کوئی 'امر آدمی' باہر نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔

بادشاہ کو یہ امید تھی کہ میں اس کے ملک میں ہمیشہ رہوں گا لیکن جب میں نے کہا کہ میں

اپنے ملک واپس جانا چاہتا ہوں تو مجبوراً مجھے جانے کی اجازت دے دی اور ڈارن شہر کے ذریعہ ایک بندرگاہ کے قریب مجھے اتار دیا گیا۔ یہاں مجھے ایک جہاز مل گیا جو جاپان جا رہا تھا۔ جاپان سے مجھے ایک دوسرا جہاز مل گیا جو انگلینڈ جا رہا تھا۔ میں ۶ر اپریل ۱۷۱۰ء کو انگلینڈ پہنچا اور وہاں سے سیدھا ریڈرف گیا جہاں مجھے اپنے بیوی بچے خیریت سے ملے۔

یاہوؤں کے مُلک میں

میں اپنے گھر پانچ مہینے رہا اور ۷ر ستمبر ۱۷۱۰ء کو اپنی بیوی بچوں سے پھر رخصت ہوا اور ایک بار پھر سمندری سفر کے لیے روانہ ہو گیا۔ مجھے ایک جہاز پر کپتان کی جگہ مل گئی تھی مگر سفر کے دوران کئی ملاح مر گئے اس لیے مجھے دوسرے آدمی بھرتی کرنا پڑے مگر یہ سب کے سب بدمعاش نکلے۔ انہوں نے ایک دن سازش کر کے مجھے گھیر لیا اور میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور سمندر میں پھینکنے کی دھمکی دی۔ میں نے بڑی ہی مشکل سے اپنی جان بچائی، بڑی منت سماجت کے بعد میرے ساتھ یہ رعایت کی گئی کہ میرے پاؤں میں زنجیر ڈال کر مجھے چارپائی کے ساتھ باندھ دیا گیا اور ایک آدمی میری نگرانی پر مقرر کر دیا گیا۔ اب میں ان کا قیدی تھا۔

ان ملاحوں کا ارادہ سمندر میں لوٹ مار کرنے کا تھا۔ لیکن ان کے پاس آدمی کم تھے اس لیے انہوں نے مڈغاسکر جا کر وہاں سے اپنے مطلب کے آدمی بھرتی کرنے کا ارادہ کیا۔

ایک دن مجھے ایک چھوٹی سی کشتی میں بٹھا کر سمندر کے کنارے چھوڑ دیا گیا۔ میرے پاس ایک تلوار کے سوائے کوئی دوسرا ہتھیار نہیں تھا۔ میں نے ضرورت کی کچھ چیزیں اور تھوڑی سی رقم اپنی جیبوں میں چھپا لی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ جہاں پر مجھے چھوڑا گیا تھا اس جگہ کا نام کیا تھا۔

میں ڈرتا ڈرتا اس جزیرے میں آگے بڑھا۔ ایک کچے راستے پر میں نے آدمیوں اور جانوروں کے پیروں کے بہت سارے نشانات دیکھے۔ مگر ان میں آدمیوں سے زیادہ گھوڑوں کے پیروں کے

نشانات تھے۔ ذرا دور میدان میں مجھے بہت سارے جانور بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ ان کی شکل و صورت عجیب و غریب تھی۔ ان کے سروں پر بڑے بڑے بال تھے، بکروں کی طرح داڑھی تھی۔ پیٹھ اور ٹانگوں پر بھی بال تھے، ان کے دُم نہیں تھی۔ اپنی زندگی میں، میں نے پہلے کبھی ایسے بدصورت جانور نہیں دیکھے تھے۔

میں اسی راستہ پر اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ ایک جانور مجھے دیکھ کر اُٹھا اور میرے پاس آیا۔ اس نے اپنا اگلا پنجہ اٹھا کر مجھ پر حملہ کرنا چاہا۔ میں نے اپنی تلوار نکال کر اپنی طرف سے اس کو مارا۔ وہ ڈر کر بھاگا اور اس نے اتنی زور سے چیخ ماری کہ قریب کے میدان سے تیس چالیس جانوروں کا ایک غول نکل پڑا اور وہ سب ایک طرف کو بھاگ گئے۔

اب میں ایک سڑک پر آ گیا تھا۔ قریب ہی مجھے ایک گھوڑا نظر آیا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور میرے قریب آیا۔ گھوڑے نے میرے چاروں طرف گھوم پھر کر مجھے دیکھا اور سونگھا اور وہ کچھ اس انداز سے ہنہنایا کہ مجھے لگا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہہ رہا ہو۔

اسی وقت ایک دوسرا گھوڑا وہاں آ نکلا۔ دونوں نے اپنا دایاں سُم ایک دوسرے سے ملایا اور وہ دونوں ہنہنائے جیسے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کر رہے ہوں۔ وہ دونوں ذرا دور تک ساتھ ساتھ گئے اور پھر میری طرف آ گئے۔ میں نے ان گھوڑوں کے اس عمل کو دیکھ کر دل ہی دل میں ان کے مالکوں کی تعریف کی جنہوں نے ان کو اس طرح سدھایا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں ان گھوڑوں کے مالکوں سے ضرور ملوں گا۔ دونوں گھوڑوں نے مجھے گھوم پھر کر خوب اچھی طرح سے دیکھا اور اپنی زبان میں کچھ کہا۔ میں ان کے اس انداز سے بے حد متاثر ہوا اور دل میں سوچا کہ یہ ضرور جادوگر ہیں، چنانچہ میں نے ان سے کہا: "جناب والا! اگر آپ جادوگر ہیں تو میری زبان ضرور سمجھ سکتے ہیں۔ میں ایک مصیبت کا مارا آدمی ہوں، میرا جہاز برباد ہو گیا ہے، براہِ مہربانی مجھے ایسی جگہ پہنچا دیجیے جہاں میں آرام کر سکوں۔"

وہ دونوں ہنہنائے اور اپنی زبان میں کچھ بولے۔ میں صرف دو الفاظ سمجھ سکا: ایک تو 'یا ہو' اور دوسرا 'ہومنی ہن'۔ سفید گھوڑے نے مجھے کچھ ایسا اشارہ کیا جیسے وہ مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہہ

رہا ہو۔ میں اس کے ساتھ ہولیا۔

تین میل پیدل چلنے کے بعد ہم لوگ بانسوں کے بنے ہوئے ایک مکان میں پہنچے جس پر پھوس کا چھپر پڑا ہوا تھا۔ میں سفید گھوڑے کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ ایک لمبے سے کمرے میں ایک میز پڑی ہوئی تھی اور ایک الماری رکھی ہوئی تھی۔ یہاں کئی گھوڑے اور تھے۔ میں نے اپنی جیب سے کچھ چیزیں نکال لیں تاکہ ان گھوڑوں کے مالک کو تحفہ کے طور پر پیش کردوں۔

سفید گھوڑے نے مجھے دوسرے کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ یہاں میں نے عجیب منظر دیکھا ایک خوبصورت گھوڑی اپنے دو خوبصورت بچوں کے ساتھ ایک چٹائی پر بیٹھی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا، اور میں اسے جادو کا کرشمہ سمجھ رہا تھا۔

گھوڑی مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور میرے قریب آکر مجھے خوب غور سے دیکھنے لگی اور گھوڑے سے کچھ کہا۔ صرف لفظ ' یاہو ' میں سمجھ سکا۔ یہ وہ لفظ تھا جو دونوں بار بار اپنی بات چیت کے دوران دہراتے رہتے تھے اس کے بعد گھوڑے نے اپنی گردن سے مجھے اشارہ کیا اور میں اس کے ساتھ آنگن میں چلا گیا۔ یہاں میں نے وہی تین بدصورت اور عجیب قسم کے جانور دیکھے جو مجھے پہلے ایک میدان میں دکھائی دئے تھے۔ تینوں کی گردن میں رسی بندھی ہوئی تھی اور وہ گاجریں اور مولیاں کھا رہے تھے، اور کچھ کچا گوشت اپنے دانتوں سے پھاڑ کر چبا رہے تھے۔

سفید گھوڑے نے ایک کم عمر والے گھوڑے کو حکم دیا اور وہ ایک انسان نما جانور کو باندھ کر میرے پاس لایا۔ مجھے اس مکروہ جانور کو دیکھ کر بہت ہی حیرت ہوئی کیوں کہ اس کی شکل و صورت انسانوں سے ملتی جلتی تھی۔ ان دونوں گھوڑوں نے ہم دونوں کی شکل و صورت کو دیکھ کر ایک بار پھر ' یاہو ' کہا۔

گھوڑے نے مجھے کھانے کے لیے ایک گاجر دی، میں نے کھانے سے انکار کردیا۔ اس کے بعد مجھے بندر کا گوشت دیا، میں نے اسے بھی نہیں کھایا، تب سفید گھوڑے نے کچھ اس طرح اشارہ کیا جیسے وہ مجھ سے پوچھ رہا ہو کہ میں کیا کھاؤں گا۔ اس وقت مجھے ایک گائے نظر آئی۔

میں نے اشاروں سے بتایا کہ میں اس کا دودھ پینا چاہتا ہوں۔ سفید گھوڑا میرا مطلب سمجھ گیا، اور اس نے دودھ لانے کا حکم دیا۔

دوپہر کے وقت ایک گاڑی میں سے جس کو چار یاہو کھینچ رہے تھے ایک بوڑھا گھوڑا اترا۔ یہ سفید گھوڑے کے یہاں دعوت کھانے آیا تھا۔ کھانے کے لیے دودھ میں اُبالے ہوئے جو تیار کیے گئے تھے۔ مجھے مہمان گھوڑے کے سامنے پیش کیا گیا۔ دونوں میرے ہی بارے میں بات چیت کر رہے تھے، ان کو اس بات کا افسوس تھا کہ میں ان کا کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ لیکن میں نے جو کی روٹی بنانا سیکھ لی تھی اور تین سال تک میں اس ملک میں رہا اس وقت تک یہی جو کی روٹی کھا کر گذارہ کرتا رہا۔

رات گذارنے کے لیے میرے میزبان گھوڑے نے یہ انتظام کیا کہ گھاس پھوس کا بستر بنا دیا۔ میرے سونے کی جگہ یاہو جانوروں کے اصطبل کے قریب ضرور تھی لیکن ان سے الگ تھی۔ میں تمام رات آرام کے ساتھ سوتا تھا۔

میں ان گھوڑوں کی زبان سیکھنا چاہتا تھا اور میرا میزبان گھوڑا اس کی بیوی اور بچے بھی مجھے اپنی زبان سکھانے کے لیے بے چین تھے۔ ان سب کو اس بات پر تعجب تھا کہ میں جو اُن کے یہاں کے یاہو جانوروں سے ملتی جلتی شکل و صورت رکھتا ہوں لیکن پھر بھی عقل رکھتا ہوں اور سمجھ بوجھ کا کام کرتا ہوں۔

دس ہفتوں کی محنت کے بعد میں ان کے سوالات سمجھنے لگا اور تین مہینوں میں اس قابل ہو گیا کہ اپنی بات ان کو سمجھا سکوں۔

2

مجھے گھوڑوں کے ملک میں رہتے ہوئے ابھی پورا ایک سال بھی نہیں ہوا تھا لیکن مجھے

ان سے بہت ہی لگاؤ اور اُنسیت ہوگئی تھی، میں نے ہمیشہ کے لیے اسی ملک میں رہنے کا فیصلہ کر لیا دراصل گھوڑوں میں ایسی بہت ساری اچھی باتیں تھیں جو انسانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ وہ بہت سادہ دل اور نیک طبیعت کے تھے۔ مکاری اور دھوکے کا تو ان کے یہاں نام بھی نہیں تھا۔ مجھے ان کی اچھی باتیں دیکھ کر انسانوں سے نفرت سی ہوگئی تھی۔

اب میں ان شریف جانوروں کی عادتوں اور زندگی گذارنے کے بارے میں کچھ باتوں کا بیان کرتا ہوں جو یقیناً دلچسپ اور بصیرت آمیز ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ تین سال گذارے تھے۔ یہ جانور فطرتاً نیک پیدا ہوتے ہیں۔ دوستی اور سچائی ان کے دو بہترین اصول ہیں، جھگڑا، فساد، جھوٹ ان کے یہاں نام کو نہیں ہوتا، وہ اپنے بچوں کو شروع ہی سے صاف ستھرا، محنتی اور ہوشیار رہنے کا سبق سکھاتے ہیں اور ان کو چاق و چوبند، مضبوط اور پھرتیلا بننے کی تعلیم دیتے ہیں۔ سال میں چار بار وہ سب ایک جگہ اکٹھا ہو کر دوڑنے، بھاگنے اور کودنے کے مقابلہ میں شریک ہوتے ہیں۔

ہر چار سال کے بعد موسم بہار میں وہ سب ایک جگہ اکٹھا ہوتے ہیں اور ملک کی عام حالت کے بارے میں غور کرتے ہیں اور گھاس اور جَو وغیرہ مہیا کرنے کے بارے میں اور گایوں، یا ہوؤں کے گلوں کی دیکھ بھال اور حالت کے بارے میں بات چیت کرتے ہیں۔

چونکہ گھوڑے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے اس لیے ساری کارروائی زبانی ہوتی ہے۔ ویسے ان کے یہاں بہت ہی اچھے شاعر بھی ہیں اور نثر لکھنے والے بھی ہیں اور ان کی شاعری میں عمدہ اور خوبصورت خیالات پائے جاتے ہیں۔ ان کی عمر ۳۰ سال کی ہوتی ہے اور جب کوئی گھوڑا خاندان کا فرد مرتا ہے تو اسے کسی چھپی ہوئی جگہ پر دفن کر دیا جاتا ہے اور مرنے والے کے رشتہ دار اور دوست نہ تو غم مناتے ہیں اور نہ ہی کسی خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

مرنے سے دس روز پہلے مرنے والے کو کسی طرح سے علم ہو جاتا ہے کہ اب وہ مر جائے گا چنانچہ وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو خدا حافظ کہنے جاتا ہے اور اپنی سواری کے لیے ایک

قسم کی گاڑی استعمال کرتا ہے جس کو 'یاہو' کھینچتے ہیں۔

اس ملک میں گھوڑوں کو کوئی بیماریاں نہیں ہوتیں۔ ساری بیماریاں 'یاہوؤں' ہی کو ہوتی ہیں اسی وجہ سے ان بیماریوں کا نام 'یاہو بیماری' ہے۔ میں تنہا کبھی 'یاہوؤں' کے گلے میں نہیں جاتا تھا۔ ہمیشہ ایک گھوڑا میری حفاظت کے لیے میرے ساتھ جاتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ 'یاہوؤں' نے مجھے دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ میں بھی ان ہی کی برادری کا ہوں لیکن وہ مجھے حقارت اور غصے سے دیکھا کرتے تھے۔ ایک بار میں نے ایک یاہو بچہ جس کی عمر لگ بھگ تین سال کی ہوگی، پکڑ لیا۔ میں نے اسے بہت چمکارا لیکن اس کم بخت نے مجھے نوچا اور دانتوں سے کاٹا اور خوب چیخا، میں نے گھبرا کر اُسے چھوڑ دیا۔ اس کی چیخنے اور رونے کی آواز سُن کر بہت سارے 'یاہو' دوڑ پڑے، لیکن یہ دیکھ کر کہ میں نے بچے کو چھوڑ دیا ہے اور میرا محافظ گھوڑا میرے قریب ہی کھڑا ہے وہ کچھ نہ بولے ورنہ ممکن تھا کہ وہ مجھے پھاڑ ڈالتے۔

مجھے اس ملک میں ہر قسم کا آرام تھا۔ میرے میزبان گھوڑے نے میرے لیے ایک گھاس پھوس کا ایک چھپّر بنا دیا۔ دیواروں پر میں نے اپنے ہاتھوں سے پلاسٹر کر دیا تھا اور زمین کو چٹائی کے فرش سے ڈھک دیا تھا۔ میں نے اپنے چاقو کی مدد سے دو کرسیاں بھی تیار کر لی تھیں۔ جب میرے کپڑے پھٹ گئے تو میں نے اپنے لیے خرگوش کی کھال کے کپڑے بنا لیے یاہو کی کھال کے جو تے بہت اچھے بنتے تھے ان کی ایڑھیاں لکڑی کی تھیں۔ میں جو کی روٹی شہد اور چڑیوں کے گوشت کے ساتھ کھاتا تھا۔ میں چڑیوں کو یاہوؤں کے بالوں سے تیار کیے ہوئے جال میں پکڑ لیتا تھا۔ اس سادہ زندگی میں مجھے بہت سکون مل رہا تھا نہ تو کسی دوست کی بیوفائی کا ڈر تھا اور نہ ہی مجھے کسی دشمن سے کوئی خطرہ تھا۔

میرا میزبان یہ جاننے کے لیے بہت بے چین تھا کہ میں کس ملک سے آیا ہوں۔ اسے یہ دیکھ کر اور بھی حیرت ہو رہی تھی کہ میں کچھ جملے اپنی یادداشت کے لیے ایک کاغذ پر لکھ رہا تھا۔ گھوڑوں کے اس ملک میں لکھنے پڑھنے کا کوئی رواج نہیں تھا اور وہ نہیں جانتے تھے کہ لکھنا پڑھنا کیا بلا ہے۔

میں نے بتایا کہ کس طرح میں نے ایک کشتی میں بیٹھ کر سمندر کو پار کیا، اور یہ کشتی لکڑی سے بنائی جاتی ہے جس کو مجھ جیسے انسان بناتے ہیں۔ مگر اس کو اس بات کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا کیونکہ اس کی سمجھ کے مطابق کوئی گھوڑا ایسی کوئی چیز نہیں بنا سکتا تھا اور نہ کسی 'یاہو' سے

یہ امید کی جا سکتی تھی کہ وہ کوئی ایسی عجیب چیز بنا سکے جو سمندر میں ڈوبے بھی نہیں اور اس پر بیٹھ کر سفر کیا جا سکے۔

جو دوسرے گھوڑے مجھے دیکھنے آتے تھے ان کا میرے بارے میں یہ خیال تھا کہ میں 'یاہو' ہی ہوں اور وہ بھی ادھورا۔ کیوں کہ میرے جسم پر لمبے لمبے بال نہیں تھے، صرف سر پر اور چہرے پر تھے۔ میں رات کو سوتے وقت اپنے کپڑے اتار کر سوتا تھا اور انہیں کپڑوں کو اوڑھ لیا کرتا تھا۔ ایک دن میرے میزبان گھوڑے نے مجھے بغیر کپڑوں کے دیکھ لیا اور حیرت سے پوچھا کہ میری کھال کا رنگ سوتے وقت سفید کیوں ہو جاتا ہے جبکہ دن میں اس کا رنگ ایسا نہیں ہوتا میں اب تک اس بات کو چھپائے ہوئے تھا کہ میں کپڑے بھی پہنتا ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا تعلق بدصورت 'یاہوؤں' سے جوڑا جائے۔

میں نے اپنے ملک کے بارے میں بہت ساری باتیں بتائیں اور کہا کہ جہاز اور کشتیاں مجھ جیسے ہی آدمی بناتے ہیں جو سارے جانداروں میں عقلمند ترین جانور ہے۔ میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ اگر میں کبھی اپنے ملک واپس گیا تو میرے لیے یہ بہت ہی مشکل ہوگا کہ میں لوگوں کو ان باتوں کا یقین دلا سکوں جو میں نے گھوڑوں کے ملک میں دیکھی ہیں۔ میرے ملک کے لوگ شاید ہی ان باتوں پر یقین کریں۔

ایک دن میرے میزبان نے بلایا، وہ کچھ پریشان سا نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اس کے ملک کی پارلیمنٹ نے اس بات پر سخت اعتراض کیا ہے کہ ایک حقیر یاہو سے میرے خاندان والوں کے دوستانہ اور برابری کے تعلقات ہیں اور پارلیمنٹ نے یہ حکم دیا ہے کہ یا تو اس یاہو کو اس کے ملک واپس بھیج دیا جائے یا اس سے یاہوؤں کی طرح کام لیا جائے۔

میں یہ سن کر مارے غم کے بے ہوش سا ہو گیا، جب مجھے ہوش آیا تو میں نے کہا کہ اب میری موت یقینی ہے کیوں کہ میں تیر کر سمندر پار کر نہیں سکتا اور کشتی بنانے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس ملک میں میسر نہیں۔ میرے میزبان نے کہا کہ مجھے دو مہینے کی مہلت ہے، اس مدت میں کوشش کر کے ایک کشتی بنا لوں، اس نے میری مدد کے لیے ایک گھوڑے کو میرے ساتھ کر دیا۔

میں دریا کے کنارے گیا جہاں سب سے پہلے اترا تھا۔ قریب ہی ایک پہاڑی تھی اس پر چڑھ کر میں نے [illegible] دوربین سے دیکھا کہ چار پانچ میل کے فاصلے پر ایک جزیرہ ہے۔ میں نے

سب سے پہلے وہاں تک جانے کا ارادہ کیا اور تیاری شروع کر دی۔

میں جنگل میں گیا اور شاہ بلوط کی بہت ساری لکڑیاں کاٹیں۔ دو ہفتوں میں جانوروں، اور یاہو کی کھال سے پردے تیار کیے۔ بہت محنت کے بعد ایک چھوٹی سی ناؤ تیار ہو گئی۔ میں نے اس ناؤ کو پہلے ایک تالاب میں چلا کر دیکھا اور اس میں جو بھی کمی تھی اس کو ٹھیک کر لیا۔ تب میں نے خرگوش کا اُبلا ہوا گوشت، ایک پیپا دودھ اور ایک پیپا پانی کا ساتھ لیا۔ یاہوؤں کی مدد سے میری کشتی سمندر کے کنارے تک پہنچائی گئی۔

اب میرے جانے کا دن آگیا۔ میں نے اپنے میزبان اور اس کے سارے خاندان والوں سے اجازت لی۔ میں نے اپنے میزبان گھوڑے کے سموں کو بوسہ دیا۔ آپ میری اس حرکت پر ہنسیں گے لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں کیونکہ آپ گھوڑوں کی رحمدلی سے واقف نہیں ہیں، جس نے مجھے بہت ہی متاثر کیا۔ بہرحال میں ناؤ پر سوار ہوا، میرا دل ان سب کی جدائی کے خیال سے رو رہا تھا۔

میں نے یہ خطرناک سفر ۱۵ر فروری ۱۷۱۴ء کو صبح ۹ بجے کے قریب شروع کیا۔ میرا میزبان اور اس کا سارا خاندان اس وقت تک کنارے پر کھڑا رہا جب تک کہ میں ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ میرا دوست سارل نیگ زور زور سے پکار کر کہتا رہا ' پیارے یاہو اپنا خیال رکھنا۔

میرا ارادہ تھا کہ کسی ویران جزیرے میں اتر پڑوں گا اور اپنے ہاتھوں سے ایک معمولی سا گھر بنا کر باقی زندگی انسانوں سے دور رہ کر گزار دوں گا۔ مجھے اب انسانوں کی مکاری اور بیوفائی سے اتنی نفرت ہو گئی تھی کہ میں ان کے درمیان رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ چند گھنٹے کے سفر کے بعد میں ایک ویران جزیرے میں پہنچ گیا۔ میں نے تین دن تک کیکڑے اور گھونگھے کھا کر پیٹ بھرا اور جو سامان میرے پاس تھا اس کو بُرے وقت کے لیے بچا رکھا۔

میں نے چوتھے روز بیس تیس مادر زاد ننگے آدمیوں کو دیکھا جو مجھ سے چار پانچ سو گز کی دوری پر تھے۔ ان میں سے چند میری طرف بڑھے۔ میں ڈر کے مارے اپنی کشتی پر بیٹھ کر کنارے سے دور ہٹ گیا۔ اور ناؤ کو کھیتا ہوا جنوب کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے ایک جہاز دکھائی دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یورپی یاہو مجھے دیکھ لیں۔ اس لیے میں نے اپنی کشتی کو کنارے کھڑا کر کے چھپ گیا لیکن جہاز والوں نے پانی لانے کے لیے کچھ آدمیوں کو کنارے بھیجا۔ ان آدمیوں نے میری کشتی کو دیکھ لیا

اور مجھے تلاش کر کے پکڑ لیا۔

وہ میری شکل و صورت اور کھال کے لباس کو دیکھ کر حیرت کر رہے تھے۔ پرتگالی زبان میں انہوں نے جو کہا میں نے اس کا جواب پرتگالی زبان ہی میں دیا جسے سن کر وہ پہلے تو بہت خوش ہوئے مگر بعد میں وہ ہنسنے لگے، دراصل میری آواز گھوڑوں کے ہنہنانے کی طرح کی تھی۔

ان لوگوں نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے نزبن لے چلیں گے جہاں سے میں لندن جا سکتا ہوں لیکن میں نے ان سے گڑگڑا کر کہا کہ اب میں انسانوں کی دنیا میں نہیں جانا چاہتا اور آزادی کی زندگی گذارنا چاہتا ہوں۔ لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی اور میرے ہاتھ پیر باندھ کر کشتی میں ڈال دیا اور کپتان کے سامنے پیش کر دیا۔

کپتان بہت شریف اور رحمدل آدمی تھا۔ میں اس کی نیک دلی سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے میرے لیے کھانا منگانے کا حکم دیا اور ایک صاف ستھرے کیبن میں ٹھہرنے کو جگہ دی۔ میں نے اپنی آزادی حاصل کرنے کی ایک اور کوشش کی اور جہاز سے پانی میں کودنا چاہا لیکن پکڑ لیا گیا، کپتان نے مجھ سے وعدہ لیا کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا ورنہ وہ مجھے قید کر دے گا۔ میں نے اس کو اپنی کہانی سنائی اور گھوڑوں کے ملک کا سارا حال بتایا، کپتان نے پہلے تو میری باتوں کا یقین نہیں کیا لیکن جب میں نے بار بار وہی کہانی دہرائی تو اسے کچھ یقین ہو گیا کیوں کہ اسی قسم کی ایک کہانی اس نے پہلے بھی کسی سے سنی تھی۔

ہم لوگ ۵ رنومبر کو لزبن پہنچے اور کپتان نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے گھر کے اندر ہی رہوں اور کسی سے نہ ملوں، دس دن کے بعد اس نے مجھے نئے کپڑے پہننے پر راضی کر لیا اور اپنے ساتھ سڑک پر سیر کے لیے لے گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب میری انسانوں سے نفرت کم ہو گئی ہے لیکن بالکل ختم نہیں ہوئی ہے۔

کپتان نے مجھ سے کہا کہ یہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے گھر واپس جاؤں اور اپنے بیوی بچوں کی خبر گیری کروں کیوں کہ کسی انسان کا ویران جگہ زندگی گذارنا ناممکن ہے۔

بہر حال میں اپنے گھر پہنچ گیا۔ میری بیوی بچے اور رشتہ دار مجھے زندہ پا کر بہت خوش ہوئے میں نے سب سے پہلے گھوڑوں کے دو بچے خریدے۔ میں ان کے ساتھ روزانہ چار گھنٹے گذارتا ہوں۔ میں ان کی بولی سمجھتا ہوں۔ اور ہم ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

اسی دن میں دنیا کا سفر

ترتیب: صفدر حسین

صفحات: 170

قیمت:- /20 روپے

ایک پرانا دوست

مصنف: ہریندر سنگھ

صفحات: 16

قیمت:- /15 روپے

ایک پہاڑی پر اسکول

مصنف: کاویری بھٹ

مترجم: محمد علیم

صفحات: 96

قیمت:- /22 روپے

ایک نائی اور رنگساز کا قصہ

مصنف: اطہر پرویز

صفحات: 148

قیمت:- /20 روپے

پردیسی

مصنف: پرتیما ناتھ

مترجم: آصف نقوی

صفحات: 16

قیمت:- /15 روپے

چراغ کا سفر

مصنف: سید محمد ٹونکی

صفحات: 36

قیمت:- /12 روپے

ISBN: 9788175874473

9 788175 874473

कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़–ए–उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110025